جنوری 2015، قیمت 10 ₹

بچوں کی دنیا

جلد:3 شمارہ:1 جنوری 2015

مدیر اعلیٰ: ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین

نائب مدیر: ڈاکٹر عبدالحی

اعزازی مدیر: نصرت ظہیر

ناشر اور طابع:

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت-/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

■ اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل

NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

Total Pages: 64

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا

جسولہ، نئی دہلی-110025

فون 49539000

شعبۂ ادارت: 11-49539009

ای میل

bachonkiduniya @ncpul.in

editor@ncpul.in

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

شعبۂ فروخت: فون: 26109746

ویسٹ بلاک-8، وِنگ-7 آر کے پورم،

نئی دہلی۔110066

ای میل: sales@ncpul.in

ncpulsaleunit@gmail.com

'بچوں کی دنیا' کی خریداری کے لیے چیک، ڈرافٹ یا منی آرڈر

بنام NCPUL، شعبۂ فروخت کے پتہ پر بھیجیں اور وضاحت طلب

امور کے لیے وہیں رابطہ فرمائیں

شاخ 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002

فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

مدیر کا خط	آپس کی باتیں	مدیر	4
یومِ جمہوریہ	نظم: چھبیس جنوری ہے	متین اچل پوری	5
عید میلادالنبی	نظم وہ نبیوں میں رحمت...	خواجہ الطاف حسین حالی	6

	پیارے نبی کی پیاری باتیں	علامہ شبلی نعمانی	7
سائنس کی الف لیلہ	ہنی بال کے سر کی حقیقت	مترجم: انیس الدین ملک	11
عظیم سائنس داں	اسحاق نیوٹن	حیدر شمسی	19
کہانیاں	میٹھا ناسور	محمد اطہر مسعود خاں	22
	پہلی غلطی آخری غلطی	آصف جلیل احمد	26
	بوڑھے کوّے کی چالاکی	امتیاز عالم	29
کامکس	بھولے بھالو کی حماقتیں	ادارہ	33
نانی کا صندوق	کہانی میری سال گرہ	حجاب امتیاز علی	38
	نظم: بولو کتنے تیتر	حسرت جے پوری	44
قسط وار ناول	رابنسن کروسو-2	ڈینیل ڈیفو	45
اردو ایس ایم ایس	یہ مزے مزے کی حکایتیں	ادارہ	55
بچّوں کا اخبار	بچّوں کی خبریں	ادارہ	59
ننھے فنکار	بچوں کی تخلیقات	ادارہ	60
اردو فیس بک	بچوں کی باتیں	ادارہ	61
انٹرنیٹ سے	انوکھے منظر	ادارہ	62

تصحیح: دسمبر 2014 کے 'بچوں کی دنیا' میں 'سب جگنوں پر مہینے کا نام درست ہونے کے باوجود سرورق پر دسمبر کی جگہ نومبر چھپ گیا جس کے لیے ادارہ معذرت خواہ ہے

آپس کی باتیں

پیارے دوستو، آپ سب کو نیا سال اور نیا موسم دونوں مبارک ہوں۔ خدا کرے کہ اس سال بھی نئی کامیابیاں آپ کے قدم چومیں اور آپ لوگوں کے دم قدم سے صرف آپ کی تعلیم گاہوں اور آپ کے گھروں میں ہی نہیں بلکہ پورے ملک میں خوشیوں کا ماحول بنا رہے۔

یوں تو دوستو نیا سال ہر سال اپنے مقررہ وقت پر آتا ہے لیکن سردی کے موسم نے اس مرتبہ کچھ دیر کر دی ہے۔ یوں سمجھ لیجیے کہ اس وقت جب 'بچوں کی دنیا' کا یہ شمارہ چھپنے کے لیے پریس میں جا رہا ہے تو یہاں قومی راجدھانی میں ابھی سردیاں آنے کا انتظار ہی چل رہا ہے۔ عام طور پر دسمبر میں دہلی ٹھنڈ سے کانپنا شروع کر دیتی ہے لیکن ابھی تک یہاں سب لوگوں کے سوئیٹر بھی صندوق سے باہر نہیں نکلے ہیں۔ دفتر موسمیات، یعنی وہ ادارہ جو موسمی تبدیلیوں پر نظر رکھتا ہے، اِسے دنیا بھر میں موسمی تبدیلیوں کے سلسلے کا ہی ایک حصہ بتا رہا ہے اور اس کا کہنا ہے کہ ایسی تبدیلیاں اس زمین پر رہنے والوں کے لیے کوئی اچھی بات نہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ موسم میں آنے والی ہر بڑی تبدیلی ہم سبھی انسانوں کے لیے خطرے کی گھنٹی ہے۔ اگر آپ اپنے اساتذہ سے اس بارے میں بات کریں یا کتابوں میں پڑھیں، یا پھر انٹرنیٹ پر موسموں کے نظام کے بارے میں جانکاری لیں تو آپ کو پتہ چلے گا کہ دنیا کے ملکوں کی سرحدیں تو بہت سی ہیں لیکن موسموں کی کوئی سرحد نہیں ہے۔ ایک جگہ پر آنے والی موسم کی تبدیلی پوری دنیا کے موسمی نظام پر اثر ڈالتی ہے۔ کہیں بارش زیادہ ہوتی ہے تو اس سے بے وقت سیلاب آتے ہیں۔ سیلاب زیادہ آتے ہیں تو سمندر میں پانی کی سطح اور اس کے درجۂ حرارت میں بدلاؤ شروع ہو جاتا ہے۔ پھر ان تبدیلیوں کا اثر موسمی ہواؤں پر پڑتا ہے تو ان کا مزاج اور رخ بھی بدلنے لگتا ہے۔ اس طرح کل ملا کر پوری دنیا کا موسم اتھل پتھل ہو جاتا ہے اور اس طرح کی تباہیاں بھی آنے لگتی ہیں جیسی پچھلے سال جموں کشمیر میں اچانک زبردست سیلاب کی صورت میں سامنے آئی تھی۔ موسموں کے مزاج کو سمجھنے والے سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ میتھین اور کاربن ڈائی آکسائڈ گیسوں کے زیادہ خارج ہونے کی وجہ سے ہماری زمین کا ماحول لگاتار گرم ہوتا جا رہا ہے، جس سے شمالی قطب North Pole اور جنوبی قطب South Pole پر برف پگھل رہی ہے، برف کے تودے Glaciers ٹوٹ کر سمندر میں گر رہے ہیں، سمندری لہروں کی حرارت میں کمی بیشی ہو رہی ہے، اور اس کا پوری دنیا پر بہت برا اثر پڑ رہا ہے۔

ظاہر ہے ان حالات کو ہم اور آپ چند لوگ مل کر ٹھیک نہیں کر سکتے۔ چند لوگوں کی وجہ سے یہ بگاڑ آیا بھی نہیں ہے۔ اس کے لیے کل ملا کر زمین پر بسنے والے سبھی انسان اور ان کی حکومتیں ذمہ دار ہیں اور وہی سب مل کر چاہیں تو حالات میں سدھار بھی آ سکتا ہے۔ اچھی بات یہ ہے کہ نقصان دہ گیسوں کے پھیلاؤ کو روکنے کے لیے پوری دنیا میں توجہ دی جانے لگی ہے، نئے پروگرام بن رہے ہیں، ماحول کو نقصان نہ پہنچانے والے سامان بازاروں میں آ رہے ہیں اور دنیا بھر کے لوگ زمین کے ماحول کو اپنا دوست بنانے کے سلسلے میں پہلے سے زیادہ سنجیدہ ہوتے جا رہے ہیں۔

چلیے موسم کی بات تو ہو گئی اب یہ بتائیے کہ نئے سال کا آپ کا ریزولیوشن یا عہد کیا ہے۔ اگر ابھی تک اس بارے میں کچھ طے نہیں کیا ہے تو کچھ ٹپس Tips آپ کو دیتے ہیں تاکہ کوئی ایک عہد چن کر آپ ملک و قوم کے ہی نہیں اپنے بھی کام آ سکیں۔ مثلاً آپ طے کر سکتے ہیں: میں اس سال ہر روز اپنے گھر، گلی یا محلے میں پانچ دس منٹ صفائی کا کام کروں گا۔ ابّو اور امّی کو پاکٹ منی سے پیسے بچا کر سال بھر میں کم سے کم ایک تحفہ ضرور دوں گا۔ پیٹھ پیچھے نہ کسی کی برائی کروں گا نہ کسی کو کرنے دوں گا۔ یوم اساتذہ پر کلاس ٹیچر کو اپنے ہاتھوں سے بنائی ہوئی کوئی چیز تحفے میں پیش کروں گا۔ سال بھر میں کم سے کم ایک شخص کو اردو لکھنا پڑھنا سکھاؤں گا۔ مگر یہ ٹپس لڑکوں کے لیے نہیں لڑکیوں کے لیے بھی ہیں۔ یقین کیجیے یہ باتیں ہیں تو بڑی معمولی سی لیکن ان سے آپ کو وہ خوشی حاصل ہوگی جو لاکھوں روپے خرچ کر کے بھی نہیں مل سکتی۔ آپ کا،

(ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین)

یوم جمہوریہ پر

❑ متین اچل پوری

چھبیس جنوری ہے!

چھبیس جنوری ہے
چھبیس جنوری ہے
آکاش نیلا نیلا
دھرتی ہری ہری ہے

خوشیوں کا ہے زمانہ
چھیڑو نیا ترانہ
اپنی ہتھیلیوں پر
جنت نئی دھری ہے
چھبیس جنوری ہے
چھبیس جنوری ہے

ہیں لوگ سارے اپنے
پورے ہوئے ہیں سپنے
یہ شانتی کی دیوی
یہ امن کی پری ہے
چھبیس جنوری ہے
چھبیس جنوری ہے

پگ پگ ہزار خوشیاں
ہیں بے شمار خوشیاں
دھرتی کی شان دیکھو
پوری کوئی بھری ہے
چھبیس جنوری ہے
چھبیس جنوری ہے

اک جشن پھر منائیں
قومی ترانہ گائیں
لہرا رہی ہے پرچم
خشکی ہے یا تری ہے
چھبیس جنوری ہے
چھبیس جنوری ہے

منزل نظر کے آگے
اپنے نصیب جاگے
اب جو ڈگر ہے سیدھی
جو بات ہے کھری ہے
چھبیس جنوری ہے
چھبیس جنوری ہے

Mateen Achalpuri Opp. Masjid Akbari chowk Biyabani Achalpur Distt Amravati- 444806 Maha.

نعت

□ خواجہ الطاف حسین حالی

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا

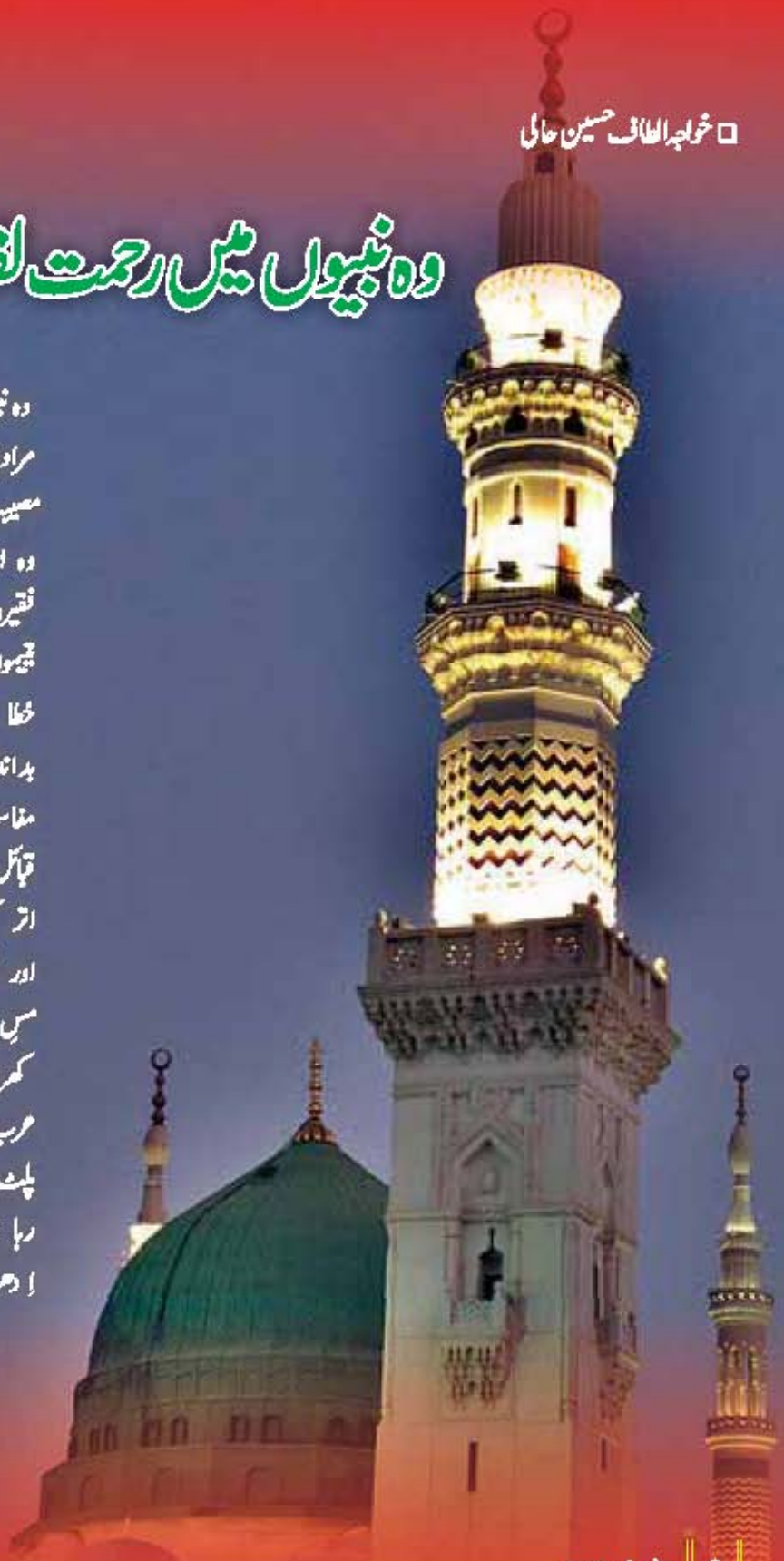

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا
وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی غلاموں کا مولیٰ
خطا کار سے در گزر کرنے والا
بد اندیش کے دل میں گھر کرنے والا
مفاسد کا زیر و زبر کرنے ولا
قبائل کو شیر و شکر کرنے والا
اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا
مسِ خام کو جس نے کندن بنایا
کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا
عرب جس پہ قرنوں سے تھا جہل چھایا
پلٹ دی بس ایک آن میں اس کی کایا
رہا ڈر نہ بیڑے کو موج بلا کا
اِدھر سے اُدھر پھر گیا رخ ہوا کا

عید میلادالنبی پر

▫علامہ شبلی نعمانی

پیارے نبی کی پیاری باتیں

بچّو ، پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ ؐ کی مبارک زندگی کے واقعات اورآپ کی پیاری پیاری باتوں، یعنی سیرت نبوی پر دنیا بھر کی زبانوں میں ہزاروں کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اردو میں بھی آپ کی سیرت پر بہت سی کتابیں موجود ہیں۔ ان میں سے ایک بہت ہی مشہور کتاب ہے سیرت النبی جو اردو کے بے حد مشہور ادیب اور اسلامی تاریخ کی بہت سی کتابوں کے مصنف علّامہ شبلی نعمانی نے سو سال سے بھی پہلے لکھی تھی۔ یہ کتاب دو حصوں میں ہے یعنی دو جلدوں میں چھاپی گئی ہے۔ کہتے ہیں رسول اکرمؐ کے بارے میں اتنی تفصیلی کتاب اردو میں کبھی نہیں لکھی گئی۔ اس میں مذہب اسلام کی تاریخ اوراس کی تعلیمات کے علاوہ رسول اللہ کی زندگی کے واقعات اور لوگوں کے ساتھ ان کے سلوک کا بیان بڑی تفصیل سے کیا گیا ہے۔عید میلاد النبی کے مبارک موقع پر یہ مضمون جو تم اب پڑھوگے، رسول اکرمؐ کے اخلاق و آداب اور حسنِ سلوک کے بارے میں ہے اور اس سے متعلق سبھی بیان علّامہ شبلی کی کتاب 'سیرت النبی جلد دوم' سے لیے گئے ہیں۔کہیں کہیں بہت مشکل لفظ ضرور بدل دیے ہیں۔اور ہاں، یہ تو تم جانتے ہی ہوگے کہ ان دنوں شبلی صاحب کی وفات اور ان کے قائم کیے ہوئے تعلیمی ادارے ندوۃ العلما کے قیام کے سو سال پورے ہونے پر شبلی صدی بھی منائی رہی ہے۔اب مضمون پڑھو اورپیارے نبی کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرو، جنھیں پوری دنیا کے محسنِ انسانیت کے لقب سے یاد کرتی ہے۔

اعزازی مدیر

عادات و اطوار: آپ (رسول اکرمؐ) نہایت نرم مزاج، خوش اخلاق، اور نیک سیرت تھے۔آپ کا چہرہ ہنستا تھا، وقار اور متانت سے گفتگو فرماتے تھے اور کسی کی دل شکنی نہیں کرتے تھے۔

معمول یہ تھا کہ کسی سے ملنے کے وقت ہمیشہ پہلے خود سلام و مصافحہ فرماتے۔کوئی شخص جھک کر آپ کے کان میں کچھ بات کہتا تو اُس وقت تک اُس کی طرف سے رخ نہ پھیرتے، جب تک وہ خود منہ نہ ہٹالے۔ مصافحہ میں بھی یہی معمول تھا۔یعنی کسی سے ہاتھ ملاتے تو جب تک وہ خود نہ چھوڑ دے اس کا ہاتھ نہ چھوڑتے۔مجلس میں بیٹھتے تو آپ کے زانو

کبھی ساتھ میں بیٹھے ہوئے لوگوں کے زانو سے آگے نکلے ہوئے نہ ہوتے...

رسول اکرمؐ کی عادت کسی کو برا بھلا کہنے کی نہ تھی۔ برائی کے بدلے میں برائی نہیں کرتے تھے۔ بلکہ درگزر کرتے تھے اور معاف فرما دیتے تھے۔ آپ کو جب دو باتوں میں اختیار دیا جاتا تھا تو ان میں جو آسان ہوتی اسے اختیار فرماتے بشرطیکہ وہ گناہ نہ ہو۔ ورنہ آپ اس سے بہت دور ہوتے۔ آپ نے کبھی کسی سے اپنے ذاتی معاملے میں انتقام نہیں لیا۔ آپ نے نام لے کر کبھی کسی مسلمان پر لعنت نہیں کی۔ آپ نے کبھی کسی غلام کو، لونڈی کو، کسی عورت کو، جانور کو اپنے ہاتھ سے نہیں مارا۔ آپ نے کسی کی کوئی (جائز) درخواست رد نہیں فرمائی۔ آپ جب گھر کے اندر تشریف لاتے تو نہایت خنداں، ہنستے ہوئے اور مسکراتے ہوئے۔ دوستوں میں پاؤں پھیلا کر نہیں بیٹھتے تھے۔ باتیں ٹھہر ٹھہر کر اس طرح کرتے کہ کوئی یاد رکھنا چاہے تو رکھ لے۔

خوش اخلاقی:... آپ خندہ جبیں، نرم خو، مہربان طبع تھے۔ سخت مزاج اور تنگ دل نہ تھے۔ بات بات پر شور نہیں کرتے تھے، کوئی برا کلمہ منہ سے کبھی نہیں نکالتے تھے۔ عیب جو اور تنگ گیر نہ تھے، کوئی ایسی بات ہوتی جو آپ کو ناپسند ہوتی تو اس سے اغماض (چشم پوشی) فرماتے۔ کوئی آپ سے اس کی امید رکھتا تو نہ اس کو مایوس کرتے تھے اور نہ منظوری ظاہر فرماتے تھے۔ یعنی صاف طور پر جتا کر انکار نہیں کرتے تھے بلکہ خاموش رہتے تھے اور مزاج پہچاننے والے آپ کے تیور سے آپ کا مقصد سمجھ جاتے تھے۔ اپنے نفس سے تین چیزیں آپ نے بالکل دور کردی تھیں ۔ بحث و مباحثہ، ضرورت سے زیادہ بات کرنا اور جو بات مطلب کی نہ ہو اس میں پڑنا۔ دوسروں کے متعلق بھی تین باتوں سے پرہیز کرتے تھے۔ کسی کو برا نہیں کہتے تھے، کسی کی عیب گیری نہیں کرتے تھے، کسی کے اندرونی حالات کی ٹوہ میں نہیں رہتے تھے۔ وہی باتیں کرتے تھے جن سے کوئی مفید نتیجہ نکل سکتا تھا... کوئی دوسرا بات کرتا تو جب تک وہ بات ختم نہ کر لیتا چپ سنا کرتے... کوئی باہر کا آدمی اگر بے باکی سے گفتگو کرتا تو آپ تحمل فرماتے ، دوسروں کے منہ سے اپنی تعریف سننا پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن اگر کوئی آپ کے احسان و انعام کا شکریہ ادا کرتا تو قبول فرماتے۔ جب تک بولنے والا خود چپ نہ ہو جاتا آپ اس کی بات درمیان سے نہیں کاٹتے تھے۔

... آپ کسی کی توہین روا نہیں رکھتے تھے، چھوٹی چھوٹی باتوں پر اظہارِ شکر فرماتے

□ کوئی شخص جھک کر آپ کے کان میں کچھ بات کہتا تو اُس وقت تک اُس کی طرف سے رخ نہ پھیرتے ، جب تک وہ خود منہ نہ ہٹالے۔ مصافحہ میں بھی یہی معمول تھا

□ آپ جب گھر کے اندر تشریف لاتے تو نہایت خنداں، ہنستے ہوئے اور مسکراتے ہوئے ۔ دوستوں میں پاؤں پھیلا کر نہیں بیٹھتے تھے

□ سخت مزاج اور تنگ دل نہ تھے۔ بات بات پر شور نہیں کرتے تھے ، کوئی برا کلمہ منہ سے کبھی نہیں نکالتے تھے

□ دوسروں کے متعلق بھی تین باتوں سے پرہیز کرتے تھے۔ کسی کو برا نہیں کہتے تھے، کسی کی عیب گیری نہیں کرتے تھے، کسی کے اندرونی حالات کی ٹوہ میں نہیں رہتے تھے

□ جب تک بولنے والا خود چپ نہ ہو جاتا آپ اس کی بات درمیان سے نہیں کاٹتے تھے۔

تھے، کسی چیز کو برا نہیں کہتے تھے، کھانا جس قسم کا سامنے آتا تناول فرماتے اور اس کو برا بھلا نہ کہتے۔ کوئی اگر کسی سچی بات کی مخالفت کرتا تو آپ کو غصہ آجاتا تھا اور اس کی پوری حمایت کرتے، لیکن خود اپنے ذاتی معاملہ پر آپ کو کبھی غصہ نہیں آیا اور نہ کسی سے بدلہ لیا۔

مجلس نبوی میں جگہ کم ہوتی تھی۔ جو لوگ پہلے سے آکر بیٹھ جاتے تھے ان کے بعد جگہ باقی نہیں رہتی تھی۔ ایسے موقع پر کوئی آجاتا تو آپ خود اپنی چادر اس کے لیے بچھا دیتے تھے۔

سلام میں پہل فرماتے تھے۔ راستے میں جب چلتے تو مرد عورت بچے، جو سامنے آتے ان کو سلام کرتے۔ ایک دفعہ آپ راستے سے گزر رہے تھے۔ ایک مقام پر مسلمان اور منافق و کافر اکٹھے بیٹھے ملے آپ نے سب کو سلام کیا۔

کسی کی کوئی بات بری معلوم ہوتی تو مجلس میں نام لے کر اس کا ذکر نہیں کرتے تھے۔ بلکہ یوں فرماتے تھے کہ لوگ ایسا کرتے ہیں، لوگ ایسا کہتے ہیں، بعض لوگوں کی یہ عادت ہے۔ ایسا اس وجہ سے کرتے کہ اس شخص کی ذلت نہ ہو اور اس کے احساسِ غیرت میں کمی نہ آئے۔

معاملات میں صفائی: آپ بے حد فیاض تھے اور فیاضی کی وجہ سے اکثر مقروض بھی رہتے تھے۔ یہاں تک کہ وفات کے وقت بھی آپ کی زرہ (جنگ میں بچاؤ کے لیے پہنا جانے والا لوہے کے تار سے بنا لباس) ایک من اناج پر ایک یہودی کے ہاں گروی تھی...

ایک دفعہ ایک شخص سے کچھ کھجوریں قرض کے طور پر لیں۔ چند روز کے بعد وہ تقاضے کو آیا۔ آپ نے ایک انصاری کو حکم دیا کہ اس کا قرض ادا کریں۔ انصاری نے کھجوریں دیں لیکن ویسی عمدہ نہ تھیں جیسی اس نے دی تھیں۔ اس شخص نے لینے سے انکار کیا انصاری نے کہا تم رسول اللہ کی عطا کردہ کھجور لینے سے انکار کرتے ہو، بولا ہاں، رسول

اللہ عدل (انصاف) نہ کریں گے تو اور کس سے توقع رکھی جائے۔ رسول اکرمؐ نے یہ جملے سنے تو آپ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور فرمایا کہ یہ بالکل سچ ہے۔

دولت جمع نہیں رکھتے تھے۔ عموماً فرماتے تھے کہ میں تین دن سے زیادہ اپنے پاس ایک دینار بھی رکھنا پسند نہیں کرتا بجز اس دینار کے جو قرض ادا کرنے کے انتظار میں اپنے پاس رکھ چھوڑتا ہوں۔

سماجی برابری: آپ کی نظر میں امیر و غریب آقا و غلام سب برابر تھے۔ آپ کے صحابی جب مل کر کوئی کام کرتے تو ہمیشہ ان کے ساتھ شریک ہو جاتے اور معمولی مزدور کی طرح کام انجام دیتے تھے۔ مدینہ میں آ کر سب سے پہلا کام مسجد نبوی کی تعمیر کا تھا۔ تعمیر میں دوسرے صحابہ کی طرح آپ بھی بہ نفس نفیس شریک تھے۔ خود اپنے مبارک ہاتھوں سے اینٹ اٹھا اٹھا کر لاتے تھے۔ صحابہ عرض کرتے تھے، ہماری جانیں قربان آپ کیوں زحمت فرماتے ہیں، لیکن آپ اپنے فرض سے باز نہ آتے۔ ایک جنگ کے موقع پر تمام صحابہ مدینے کے چاروں طرف خندق کھود رہے تھے۔ آپ بھی ایک ادنیٰ مزدور کی طرح کام تے رہے، یہاں تک کہ شکم مبارک پر مٹی اور خاک کی تہہ جم گئی تھی۔

ایک سفر میں کھانا تیار نہ تھا۔ تمام صحابہ نے مل کر کھانا پکانے کا سامان کیا۔ لوگوں نے ایک ایک کام بانٹ لیا۔ جنگل سے لکڑیاں لانے کا کام آپ نے اپنے ذمے لیا۔ صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ یہ کام ہم خدام کر لیں گے۔ فرمایا ہاں یہ سچ ہے لیکن مجھے یہ پسند نہیں کہ میں تم سے اپنے آپ کو ممتاز کروں۔ خدا اس بندے کو پسند نہیں کرتا جو

روضۂ رسولؐ کی سنہری جالیاں

اپنے ساتھیوں میں ممتاز بنتا ہے۔

سادگی و انکساری: سادگی و انکساری کا یہ عالم تھا کہ آپ گھر کا کام کاج خود کرتے، کپڑوں میں پیوند لگاتے، گھر میں خود جھاڑو دیتے، دودھ خود دوہ لیتے، بازار سے سودا لاتے، جوتی پھٹ جاتی تو خود گانٹھ لیتے (گدھے کی سواری سے آپ کو عار نہ تھا، غلاموں اور مسکینوں کے ساتھ بیٹھنے اور ان کے ساتھ کھانا کھانے سے پرہیز نہ تھا) ایک دفعہ گھر سے باہر تشریف لائے، لوگ تعظیم کو اٹھ کھڑے ہوئے، فرمایا کہ اہل عجم کی طرح تعظیم کے لیے نہ اٹھو۔ غریب سے غریب شخص بھی بیمار ہوتا تو مزاج پرسی کو تشریف لے جاتے، مفلسوں اور فقیروں کے ہاں جا کر ان کے ساتھ بیٹھتے تو ایسے بیٹھتے کہ امتیازی حیثیت ہونے کی بنا پر کوئی آپ کو پہچان نہ سکتا۔ کسی مجمع میں جاتے تو جہاں جگہ ملتی بیٹھ جاتے۔

ایک دفعہ ایک شخص ملنے آیا لیکن نبوت کا رعب اس پر ایسا پڑا کہ کانپنے لگا۔ آپ نے فرمایا گھبراؤ نہیں، میں بادشاہ نہیں ایک قریشی عورت کا بیٹا ہوں جو سوکھا گوشت پکا کر کھایا کرتی تھی۔

تواضع اور خاکساری کی راہ سے آپ اکڑوں بیٹھ کر کھانا تناول فرماتے تھے۔ اور فرمایا کرتے تھے میں بندہ ہوں اور بندے کی طرح کھاتا ہوں اور بندوں کی ہی طرح بیٹھتا ہوں۔ ایک دفعہ کھانے کے موقع پر جگہ تنگ تھی اور لوگ زیادہ آ گئے۔ آپ اکڑوں بیٹھ گئے کہ جگہ نکل آئے۔ ایک بدو بھی مجلس میں شریک تھا۔ اس نے کہا، محمدؐ! یہ کیا بیٹھنے کا انداز ہے؟ آپ نے فرمایا خدا نے مجھے خاکسار بندہ بنایا ہے، جبار و سرکش نہیں بنایا ہے!□

□ مترجم: انیس الدین ملک/نظر ثانی: نصرت ظہیر

سائنس کی الف لیلہ

ہنی بال کے سرکے کی حقیقت!

دنیا کی تاریخ کا مشہور فوجی جنرل ہنی بال Hannibal کارتھیج Carthage کا رہنے والا تھا جو ایک زمانے میں ایک عظیم الشان شہر تھا، جس کی آبادی سات لاکھ تھی اور اس کی سلطنت افریقہ کے شمالی ساحل تک پھیلی تھی جس میں بحرِ روم کے بہت سے جزیروں کے علاوہ اسپین کا کچھ علاقہ بھی شامل تھا۔ اپنی مختصر تاریخ میں اس شہر نے روم پر حاوی ہوجانے کے لیے جدوجہد کی لیکن آخر میں شکست کھائی اور حضرت عیسیٰؑ سے 146 پہلے میں یہ شہر پوری طرح سے برباد کردیا گیا۔ اس کے باشندے یا تو قتل ہوئے یا اِدھر اُدھر بھاگ گئے۔ اس کی عمارت کو جلا دیا گیا اور اس کی بنیادوں پر ہل چلا دیے گئے۔

ہنیبال جب پیدا ہوا تو یہ شہر اپنی قوت و شہرت کے عروج پر تھا۔ اس کے والد نے جو خود بھی ایک کارتھیجی جنرل تھے، بالکل کم عمری سے اسے فنِ سپاہ گری سکھایا تھا۔ جب وہ صرف نو سال کا تھا تو وہ فوج کے ساتھ اسپین گیا اور جانے سے پہلے اپنے والد کے حکم کے مطابق یہ قسم کھائی کہ وہ روم سے ہمیشہ دشمنی رکھے گا اور اس وعدے کو اس نے

تاریخ کے کئی ناقابلِ یقین واقعے ایسے ہیں جن کی حقیقت کچھ اور ہے۔ اس مضمون میں مشہور عالم فوجی جنرل ہنی بال اور مصر کی ملکہ کلوپطرہ کے دو واقعات کا سائنسی تجزیہ Analysis کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس سے چیزوں کو کسی محلول اعظم Super Solvent میں گھولنے کی کوششی سامنے آتی ہے جو علم کیمیا Chemistry کی سائنسی شاخ کے وجود میں آنے کے تین پرانے مقصدوں میں سے ایک ہے۔ یہ مقصد تھے: آبِ حیات بنانا جسے پی کر آدمی ہمیشہ زندہ رہے۔ ایسا طریقہ ڈھونڈنا جس سے کسی معمولی دھات کو سونے میں بدلا جا سکے۔ اور تیسرا مقصد تھا کوئی ایسا محلول تیار کرنا جس میں دنیا کی ہر چیز گھل جائے حالانکہ نہیں سوچا گیا کہ ایسا محلول تیار ہوبھی گیا تو اسے رکھا جائے گا کس چیز میں؟ خیر، یہ تینوں چیزیں تو نہ بن سکیں لیکن انہیں بنانے کی کوششوں نے کیمسٹری کا سائنسی دروازہ ضرور کھول دیا جس نے دنیا کی شکل بدل کر رکھ دی۔ ن ف

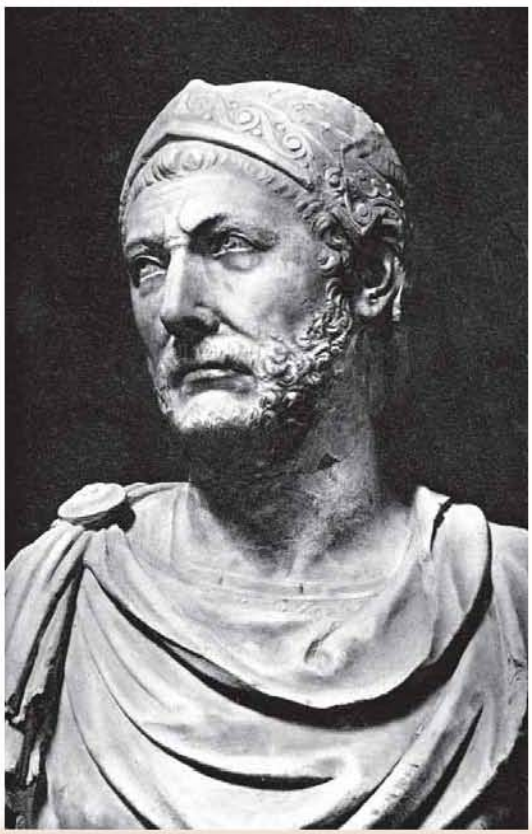

ہنی بال کا مجسمہ

زندگی بھر نبھایا۔

221 قبل عیسیٰ مسیح میں سپاہیوں نے اسے کارتھیج کے قبضے میں آئے ہوئے اسپین کا حکمراں مقرر کیا اور وہ اپنے عہد کو پورا کرنے کا منصوبہ بنانے لگا۔ 218 قبل مسیح کی بہار میں اٹلی کو فتح کرنے اور روم کی طرف کوچ کرنے کی ساری تیاریاں مکمل ہوگئیں اور وہ 90,000 پیدل فوجی، بارہ ہزار گھوڑ سوار اور 37 ہاتھیوں کے ساتھ روانہ ہوا۔ ہاتھیوں کا استعمال کرنے کے پیچھے ہنی بال کا یہ خیال تھا کہ جب یہ ہاتھی دشمنوں کی طرف بڑھائے جائیں گے تو جنوبی ہاتھیوں کا منظر ایسا دہشت ناک ہوگا کہ دشمنوں میں بے اطمینانی پھیل جائے گی۔

ہنی بال نے سمندری یا عام خشکی کا راستہ اختیار کرنے کے بجائے اپنی فوج کو جنوبی فرانس کے راستے سے یعنی یوروپ کہ سب سے اونچے پہاڑوں آلپس Alps کے کم اونچے مقامات سے گزرنے کا حکم دیا۔ یہ راستہ پندرہ سو میل کا تھا۔ اس کے بیشتر سپاہی جو افریقہ کی گرم زمین کے باشندے تھے، پہلی بار برف سے ڈھکی آسمان کو چھوتی ہوئی پہاڑ کی چوٹیوں کو دیکھ کر دہشت زدہ ہوگئے۔ لیکن ہنی بال ناخوش نہیں ہوا اور سپاہیوں کو پہاڑ پر چڑھنے کا حکم دے دیا۔

پہاڑ پر چڑھائی کے دوران آلپس کے نشیب میں رہنے والے باشندوں نے حملہ کیا جو برف، اولے اور کہرے کے باوجود منتشر سپاہیوں کو قتل کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ نویں دن یہ تھکی ہاری فوج پہاڑ کی چوٹی پر پہنچی اور وہاں پڑاؤ ڈالا۔ ہنی بال نے یہ محسوس کیا کہ اس کی فوج کو ہمت افزائی کی ضرورت ہے اس لیے اس نے سب کو جمع کیا۔ پہاڑوں کے چاروں طرف ملک ایک کھلے نقشے کی مانند آرہا تھا اور وہ پہاڑ ماؤنٹ کا وسیع اور زرخیز میدان دیکھ رہے تھے۔ ہنی بال نے میدانوں کی جانب اشارہ کرکے کہا کہ تمہارے سامنے اٹلی اور روم ہے اور نیچے جانے کا راستہ آسان ہے ایک یا دو جنگوں کے بعد یہ سب ہمارے قبضے میں ہوگا۔

لیکن ہنی بال کو سخت غلط فہمی تھی کیونکہ اترتے وقت فوج کو پہلے سے بھی زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا تھا۔ نیچے کے تنگ راستے برف اور اولوں سے اس قدر ڈھکے ہوئے تھے کہ اکثر راستوں کو دیکھنا ناممکن تھا اور جو اس راستے سے بٹاوہ پہاڑ سے گر کر ایک اذیت ناک موت مرتا تھا۔ جلد ہی سپاہیوں کا گزر ایک ایسے تنگ راستے سے ہوا جو گری ہوئی چٹانوں سے پوری طرح بند تھا۔ اس راستے کے اوپر اور چاروں طرف زمین اولے اور برف سے ڈھکی ہوئی تھی اور چلنے کے قابل نہیں تھی۔ لیکن وہ لوگ راستے میں رکاوٹ ڈالنے والی چٹانوں کو توڑ کر راستہ بنا کر اپنا سفر جاری رکھ سکے۔ رات آنے پر فوج نے پڑاؤ ڈالا۔

دوسرے دن علی الصبح ہنی بال نے اپنے سپاہیوں کو آس پاس کے بڑے بڑے درختوں کو گرا کر اور انھیں گھسیٹ کر ٹوٹی ہوئی چٹانوں کے چاروں طرف جمع کرنے کا حکم دیا۔ اس نے تیز ہوا کا انتظار کیا اور پھر لکڑیوں کو آگ لگادی۔ چٹانیں گرم ہوگئیں تو اس نے ان پر سرکہ

کیلکیریس Calcareous چٹانیں

ڈالنے کا حکم دیا۔ سرکہ ڈالنے سے چٹان گھل کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تبدیل ہوگئی۔ پھر اس نے اپنے سپاہیوں کو کہا کہ وہ اپنے لوہے کے اوزاروں سے راستے کو صاف کردیں۔

اب راستہ کھل گیا تھا لیکن فوج بڑی خستہ حال تھی۔ ان کا خوردونوش کا سامان تیزی سے ختم ہورہا تھا اور جانوروں کے کھانے کے لیے بہت تھوڑا چارا رہ گیا تھا۔ پہاڑوں پر اگی ہوئی ہلکی سی گھاس برف سے ڈھکی ہوئی تھی۔ مگر ہنی بال آگے بڑھتا ہی رہا اور ٹھیک وقت پر اٹلی کی طرف آلپس کے نچلے حصے پر پہنچ گیا۔

یہ پندرہ دن کا سفر بہت ہی خطرناک تھا۔ دو ہزار سال بعد تاریخ عالم کے ایک اور بڑے جنرل نپولین نے یہ مشکل ترین سفر کیا لیکن اس نے اس سے کہیں آسان اور چھوٹا راستہ اختیار کیا۔ ہنی بال کے نقصانات کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ اس کے کئی ہزار سپاہی پہاڑوں کی نذر ہوگئے اور کھانے پینے کا سامان اور دوسری چیزیں بھی ضائع ہوگئیں۔ لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری۔ اپنی فوج کے کچھ دن آرام کرلینے کے بعد اپنے دشمنوں پر حملہ کرنے کے لیے وہ آگے بڑھا۔

سائنس دانوں کے لیے ہنی بال کے آلپس کو پار کرنے کے واقعے میں سب سے زیادہ دلچسپ سرکہ کے ذریعہ چٹان کو گھلانے والی بات تھی۔ پچھلے دو سو سال میں اس واقعہ پر کئی دلچسپ بحث مباحثے ہوئے، اور یہ جاننے کی کوشش کی گئی کہ ہنی بال کو یہ خیال کیوں آیا تھا۔

اٹھارویں صدی میں کیمیا Chemistry کے ایک ماہر کے خیال میں، جس نے ہنی بال کے آلپس کو پار کرنے کا بہت تفصیلی مطالعہ کیا تھا، اس واقعے کی صداقت کا دو صورتوں میں پتہ لگ سکتا ہے۔ اول تو یہ کہ یہ ثابت ہوجائے کہ ہنی بال اپنے ساتھ سرکہ لے کر چلا تھا یا یہ کہ

چٹانیں چونے کے پتھر Lime Stone یا سنگِ مرمر Marble کی بنی تھیں۔

یہ بات عام طور سے معلوم ہے کہ سرکہ رومن سپاہیوں کے استعمال کرنے والی مشروبات میں سے ایک تھا۔ مثال کے طور پر جولیس سیزر اپنے جنگی سفر کے دوران خاصہ تیز سرکہ لے کر چلتا تھا جسے وہ کافی پانی ملا کر تھکے ہوئے سپاہیوں کو پینے کے لیے دیتا تھا۔ اس تازگی بخش شربت کو پوسکا کہتے تھے۔ اس بات کو مان لینا بے جا نہ ہوگا کہ کارتھیجی بھی اس مشروب کو استعمال کرتے تھے۔ اس لیے اس بات کا پورا امکان ہے کہ ہنی بال کے پاس تیز سرکا کافی بڑی مقدار میں رہا ہوگا۔

یقینی طور پر یہ کسی کو نہیں پتہ کہ یہ چٹانیں مسافرت کے کونسے حصے میں تھیں ہوسکتا ہے کہ یہ چٹانیں اس قسم کی ہوں کہ شدید گرم ہونے پر قلعی کے چونے میں تبدیل ہوجاتی ہوں۔ اس قسم کی چٹانوں کو سائنس داں کیلکیریس Calcareous کہتے ہیں۔

سرکہ ایک محلول ہے جس میں ایسٹک ایسڈ ہوتا ہے جو کیلکیریس چٹانوں سے مل کر ایک طرح کا نمک جسے کیلشیم ایسیٹیٹ کہتے ہیں بناتا ہے۔ یہ قلعی کے چونے سے مل کر یہی حل پذیر نمک بھی بناتا ہے۔ اس لیے اگر چٹان کیلکیریس تھی تو ہنی بال نے چٹانوں کو گرا کر راستہ بنالیا ہوگا۔ لیکن اس کے لیے بہت بڑی مقدار میں سرکہ استعمال کیا گیا ہوگا۔

صرف لیوی نے ہی اس بات کا تذکرہ نہیں کیا کہ سرکہ کے استعمال سے چٹانیں ٹوٹ جاتی ہیں۔ اس سے قبل پلینی نے بھی تحریر کیا تھا کہ جب ٹھنڈا سرکہ گرم چٹانوں پر ڈالا جاتا ہے تو یہ ٹوٹ جاتی ہیں جبکہ صرف گرم کرکے انھیں توڑنے کی ترکیبیں ناکامیاب رہیں۔ وٹروویس نے بھی لکھا ہے کہ جب چٹانوں کو آگ میں گرم کیا جاتا ہے اور ان پر سرکہ ڈالا جاتا ہے تو یہ ریزہ ریزہ ہوکر گھل جاتی ہیں۔

لیکن مصنف پولی بیس نے ہنی بال کے سرکہ استعمال کرنے کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ یہ بہت ہی الجھن میں ڈالنے والی غلطی ہے کیونکہ پولی بیس نے نہ صرف سب سے پہلے اس جنگی سفر کا بیان لکھا ہے بلکہ اس کا خاصہ گہرا مطالعہ کیا اور ان بہت سے آدمیوں سے بات کی تھی جو اس واقعہ کے دوران زندہ تھے۔ وہ خود اس وقت ایک بچہ تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سرکے کے اس استعمال کا بیان لیوی سے پہلے کسی نے نہیں کیا۔ لیوی نے اس کے استعمال کا بیان اصل واقعے سے ایک سو سال بعد کیا۔ بعد کے مصنفوں نے لیوی کی کہانی کو بلا

تصدیق کے صحیح مان لیا ہے۔ ان میں سے ایک نے اس واقعے کا بیان اس طور پر کیا ہے کہ ''ہنی بال نے اونچی چٹانوں کو، جن پر شعلوں سے گرم کر کے سرکہ ڈالا گیا تھا، کاٹ کر چھوٹا کر دیا۔''

پرانے زمانے کے لوگ بڑی چٹانوں کو توڑنے کا ایک اور طریقہ جانتے تھے۔ چٹانوں کو شدید گرم کیا جاتا تھا اور ان پر ٹھنڈا پانی ڈال دیا جاتا تھا۔ اس سے چٹانوں میں شگاف پڑ جاتے تھے اور لوہے کی چھڑی، کندوں اور دوسرے اوزاروں سے ان شگافوں کو تب تک چوڑا کیا جاتا تھا جب تک پتھر ٹوٹ کر الگ نہ ہو جائیں۔

لیوی کے سرکہ کے استعمال کے بارے میں کئی شک وشبہات ہیں۔ یہ بات مشکوک ہے کہ ٹوٹی ہوئی چٹانیں اس قسم کی تھیں جو شدید گرم کرنے سے چونے میں تبدیل ہو جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ یہ تو ممکن ہے کہ ہنی بال اس جنگی سفر میں سرکہ اپنے ساتھ لایا لیکن اس میں کافی شبہ ہے کہ اس لمبے اور سخت سفر کے لگ بھگ ختم ہوتے ہوتے اتنا سرکہ بچ رہا ہو جو چٹانوں کو گلانے کے لیے کافی تھا۔

خاص طور سے یہ بات یقین کے قابل نہیں کہ ہنی بال یا اس کا کوئی آفیسر یہ جانتا ہو کہ گرم چٹانوں پر ٹھنڈا پانی ڈال کر اسے توڑا جا سکتا ہے۔ اگر وہ جانتے تھے تو اتنے بے وقوف نہیں ہوں گے کہ وہ سرکے کو ضائع کرتے جبکہ ٹھنڈا پانی، اولے اور برف کی شکل میں کثرت سے چاروں طرف موجود تھا۔

سرکہ کے استعمال کا اس واقع کے سو سال بعد تک کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ جبکہ سپاہیوں کے مشروب کا یہ سستی خیز استعمال یقیناً شراب خانوں میں ان کی گپ شپ کا ایک مقبول موضوع ہوتا خاص طور سے اس وقت جب سپاہی آبادی والے حصوں میں پہنچتے۔ یقیناً یہ پرانے سپاہیوں کی داستان، بہت کچھ بڑھا چڑھا کر ہونے والی گفتگو کا ایک مقبول موضوع بن گئی۔ یہ بھی تعجب کی بات ہے کہ پولی بیس، جس نے اس فوجی سفر کا بیان کافی تحقیقات کے بعد لکھا تھا اس کے بارے میں کبھی کچھ نہیں سنا۔ اگر اس نے اس واقع کو سنا ہوتا تو یقیناً کچھ نہ کچھ لکھتا بشرطیکہ یہ اچھی طرح ثابت ہو گیا ہوتا کہ یہ کہانی جھوٹی ہے۔

لیوی کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ تاریخ لکھتے وقت بڑی احتیاط رکھتا تھا۔ اس لیے اس کہانی کے بارے میں انگیال غور کرنے کے قابل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شمالی اٹلی میں پہلے With an Iron W edge (ترجمہ: لوہے کے نوکیلے اوزار سے) کے لیے لفظ acuto استعمال ہوتا تھا۔ یہ اٹلی کی زبان میں سرکے کے لیے استعمال ہونے والے لفظ اسیٹو، اس سے تھوڑا ہی مختلف ہے۔

لیوی کا خیال ہے کہ سپاہیوں نے لوہے کے نوکیلے ٹکڑوں کو پھنسا کر چٹانوں کو توڑا ہوگا۔ یہ کہانی ایک سے دوسرے تک برسوں تک چلتی رہی ور کسی مقام پر لفظ acuto بگڑ کر اسیٹو میں تبدیل ہو گیا۔ اور یہ غالباً کسی سننے والے کے غلط سننے کی وجہ سے ہوا اور جب لیوی نے اس جنگی سفر کی روداد لکھنے کی تیاری کی تو اس اطلاع کی تصدیق پر زیادہ غور کیے بغیر لفظ اسیٹو کا استعمال کیا۔

قلوپطرا موتی گھول کر پی گئی

مصر کی ملکہ قلوپطرا نہ صرف اپنے زمانے کی سب سے زیادہ حسین ملکہ تھی بلکہ اس کے پاس دلفریبی، ذہانت اور بہت زیادہ دولت بھی تھی۔ ان خوبیوں کو اپنے ذاتی فائدے کے لیے استعمال کرنے میں وہ ذرا بھی نہیں جھجکتی تھی۔

تقریباً چالیس سال قبل مسیح رومن حکمراں انطونی یونان اور ایشیائے کوچک کی طرف روانہ ہوا اور وہاں کے باشندوں کو مجبور کیا کہ وہ روم کی حکومت کے اطاعت قبول کریں۔ اس مہم کے دوران اسے معلوم ہوا کہ قلوپطرا اس کے دشمنوں کی مدد کر رہی ہے اس لیے اس نے قلوپطرا سے جواب طلبی کی۔ ملکہ نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ خود اس سے ملے گی اور اس پر لگائے گئے الزامات کا جواب دے گی۔ اس کے لیے اس نے اپنے دلفریب حسن اور دولت کا حربہ استعمال کرنے کا ارادہ کیا تاکہ انطونی اس پر عاشق ہو جائے اور اس طرح اُس پر منڈلانے والا خطرہ ٹل جائے۔ ملکہ اپنے شاہی جنگی جہاز میں ملاقات کے لیے روانہ ہوئی۔ اس جہاز کے ہمراہ بہت سے چھوٹے جہاز بھی تھے اور یہ سب ایک عالیشان جلوس کی شکل میں نکلے۔ شاہی جہاز پر کام کرنے والوں نے اودے کپڑے پہن رکھے تھے۔ اس کے مستول پر سونا چڑھا ہوا تھا اور اس کے چپو چاندی کے بنے ہوئے تھے۔ ملاح جہاز کو اس طرح چلا رہے تھے کہ کھپوے اور بانسری، پائپ اور باجے کی موسیقی کی آوازیں آپس میں میل کھا رہی تھیں۔ جہاز میں ایک عالیشان شامیانہ تھا جس پر سونے کی شاندار کشیدہ کاری کی گئی تھی۔ اس کے نیچے ایک قلوپطرا نفیس لباس میں محبت کی یونانی دیوی وینس کی مانند نظر آ رہی تھی اور اس کو عشق کے یونانی دیوتا کیوپڈ کے لباس میں سجے دھجے لڑکے جھلملاتے پنکھوں سے ہوا جھل رہے تھے۔ خوبصورت لڑکیاں سمندری پریوں کے لباس میں بادبان کی ریشمی ڈوریوں کو پکڑے ہوئے تھیں۔

قلوپطرا دیکھنے والوں کی بے قراری بڑھانے کے لیے جہاز ہی میں رہی جبکہ انطونی بے قرار ہو کر اس بے مثال آن بان کو دیکھنے لگا۔ اس کے خیر مقدم کے لیے طباقوں میں لوبان جلائے گئے جس سے دریا کے کنارے جمع تمام لوگ خوشبوؤں میں نہا گئے۔ شام کا جھٹپٹا ہوتے ہی مستولوں پر مختلف شمعیں روشن کی گئیں جس سے ایک دلکش منظر دیکھنے میں آ رہا تھا۔

انطونی جہاز پر ملکہ سے باز پرس کرنے آیا تھا لیکن وہ ملکہ کے دلفریب حسن کے جادو میں گرفتار تھا اور رات کے کھانے کے لیے جہاز پر رکنے کو تیار ہو گیا۔ اس کے کھانے کی تیاریاں نہایت اہتمام سے ہونے لگیں۔

کھانے کے کمرے کے فرش پر کئی انچ موٹی پھولوں کی تہ بچھا دی گئی اور کوچوں اور دیواروں کو بنفشی اور سنہری کشیدہ کاریوں سے سجایا گیا۔ کھانا سونے کی ان پلیٹوں میں لایا گیا جن میں بیش قیمت اور جگمگاتے پتھر جڑے تھے۔ سنہری جام جن میں شراب پی گئی تھی جواہرات سے سجے ہوئے تھے۔ کھانا بہت لذیذ تھا۔ انطونی نے جو کچھ دیکھا اس سے بے حد مسرور ہوا اور پُرزور الفاظ میں تعریف کی۔

قلوپطرا بڑی عقل مند تھی۔ اس نے انتونی پر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ اس طرح رہنا اس کی روزمرہ زندگی کا حصہ ہے۔ اس نے اس اعزازی دعوت میں استعمال ہوئے تمام سنہری پلیٹیں، قاب، جواہرات سے سجے جام غرض تمام برتن تحفتاً اسے پیش کر دیے۔ اس نے اسے اسی طرح جہاز میں مہمان بنے رہنے کی دعوت دی جسے اس نے قبول کر لیا اور اس طرح دونوں کو ایک ساتھ ناچنے اور رنگ رلیاں منانے کا خوشگوار موقع ہاتھ آ گیا۔

ایسی اور بھی کئی بیش قیمت ضیافتیں ہوئیں جن سے انطونی بہت متاثر ہوا اور ان دعوتوں پر خرچ کی گئی بے پناہ دولت سے حیران رہ

گیا۔ قلوپطرا نے اسے بتایا کہ یہ رقم اس کے لیے بہت ہی حقیری ہے۔ قلوپطرا نے اسے بتایا کہ اگر وہ واقعی ایک شاندار ضیافت میں شرکت کرنا چاہتا ہے تو وہ اس کا انتظام کرے گی جس کی لاگت دس ہزار سیسٹر ٹیاز (تقریباً 40 لاکھ روپے) ہوگی۔

انتونی نے کہا کہ ایک ضیافت پر اتنا روپیہ خرچ کرنا ناممکن ہے۔ قلوپطرا نے شرط لگائی کہ دوسرے ہی دن وہ ایسی ضیافت کر سکے گی۔ شرط منظور کر لی گئی۔ انتونی کا جنرل پلانکس اس شرط کا ریفری مقرر ہوا۔

دوسرے دن انتونی اور اس کے جنرل جہاز پر گئے۔ ظاہری طور پر یہ دعوت پہلی دعوت کے مقابلے میں کوئی زیادہ قیمتی معلوم نہیں ہوتی تھی لیکن دعوت کے آخیر میں قلوپطرا نے اعلان کیا کہ اب تک دعوت میں خرچ کی گئی دولت نفی کے برابر تھی۔ لیکن اب وہ صرف اپنی ہی ذات پر دس ہزار سیسٹر ٹیاز خرچ کرے گی۔ اس نے اپنے آپ کو ہیرے جواہرات سے سجا رکھا تھا اور دونوں کانوں میں ایک ایک بڑا موتی آویزاں تھا۔ دونوں کی قیمت دس ہزار سیسٹر ٹیاز تھی۔ اس نے سرکے سے بھرا ایک جام منگایا جو اس کے خادموں نے فوراً لا کر پیش کر دیا۔ پھر اس نے اپنے کان سے موتی نکالا اور سرکہ میں ڈال دیا۔ ہر شخص حیرت زدہ تھا اس نے محلول کو ایک ہی گھونٹ میں پی لیا۔ اب اس نے اپنے دوسرے کان سے موتی نکالا ہی تھا کہ شرط کے ریفری پلانکس نے یہ فیصلہ دے دیا کہ وہ شرط جیت گئی ہے۔

موتی اور سرکے کی یہ کہانی پلینی نے بیان کی ہے اور یہ عام طور سے سچی مانی جاتی ہے۔ اسی طرح کے اور بھی واقعے بیان کیے گئے ہیں۔ ایک تاریخ داں ایسوپس بیان کرتا ہے کہ ایک رومن باشندے نے جس کا نام کلوڈیس تھا، اپنے باپ سے ورثے میں بہت بڑی رقم پائی۔ اس نے یہ شیخی ماری کہ وہ ایک بیش قیمت موتی سرکے میں گھولے گا، لیکن قلوپطرا کی طرح شرط جیتنے کے لیے نہیں بلکہ یہ جاننے کے لیے کہ موتی کا ذائقہ کیسا ہوتا ہے۔ اس نے ایسا ہی کیا اور چونکہ اسے یہ مشروب بہت ذائقہ دار لگا، اس لیے اس نے اپنے مہمانوں میں سے ہر ایک کو ایک موتی اس مشروب کا مزا چکھنے کے لیے دیا۔

قلوپطرا اور موتی کا واقعہ بیان کرنے والے پلینی نے، کچھ دوائیں بنانے کی ترکیبیں بھی لکھی ہیں جن میں سے ایک گٹھیا کی بھی ہے۔ اس دوا میں سستے اور چھوٹے موتیوں کو ایک مہین سفوف کی شکل میں پیس کر اور سرکے میں ڈال کر پیا جاتا ہے۔

موتیوں کو پیس کر جو سفوف ملتا ہے اس میں بیشتر کیلشیم کاربونیٹ ہوتا ہے جو تمام تیزابوں میں، جن میں سرکہ بھی شامل ہے، گھل جاتا ہے۔ لیکن اس میں کچھ نہ گھلنے والی راکھ بھی ہوتی ہے۔ ایک پورے موتی کا جو حفاظتی کھال سے ڈھکا ہوتا ہے، سرکہ میں چند سیکنڈ میں گھل جانا حیرت کی بات ہے۔ اس لیے یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ قلوپطرا کا موتی اتنی جلدی سرکے کے جام میں گھل گیا تھا اور وہ بے خوفی سے اسے پی گئی۔

اس سلسلے میں کئی انوکھی تاویلیں ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ کیونکہ قلوپطرا اس زمانے کے علم کیمیا سے اچھی طرح واقف تھی اس لیے اس مشروب میں دعوت سے قبل ہی کوئی ایسی شے ڈال دی گئی ہوگی جس سے اس میں موتی کو فوراً گھلا لینے کی خاصیت آ گئی ہو۔ لیکن اس خیال کو سامنے رکھنے والے مصنف نے اس شے کا نام نہیں کیا ہے۔ ایک اور خیال کے مطابق، قلوپطرا نے کھڑیا مٹی کا ایک ویسا ہی موتی بنوایا ہوا اور اس کو پہن لیا ہوتا کہ دعوت کے قبل وہ اصلی موتی کے بہانے نقلی موتی کو گھول لے۔ لیکن قلوپطرا کے کردار کے پیش نظر اس سے ایسے اوچھے پن کی امید نہیں کی جا سکتی ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے اصلی موتی پیالہ میں ڈالا ہو اور اس کو گھلنے سے پہلے ہی سرکہ کے سمیت نگل گئی ہو لیکن ظاہر یہ کیا ہو کہ واقعی موتی گھل گیا تھا۔

قلوپطرا اور موتی کی یہ کہانی بہت سے قدیم رومی مصنفوں نے تحریر کی ہے۔ ان کے مطابق یہ کہنا کہ یہ کہانی فرضی ہے بہت مشکل ہے۔ درحقیقت ایک مصنف نے تو دوسرے موتی کی کہانی بھی تحریر کی ہے، اس کے مطابق اس موتی کو روم لے جایا گیا اور اس کے دو ٹکڑے کر کے انھیں وینس کے مجسمہ کے کانو میں سجانے کے لیے استعمال کیا گیا۔

سر تھامس گریشم/ پینٹنگ

موتی کو سرکے میں گھولنے کی اس طرح کی کہانی مشہور مالدار ایلزبیتھن سر تھامس گریشم کے بارے میں بھی کہی جاتی ہے۔ 1564 میں سر تھامس نے ایک بڑی عمارت بنوائی تا کہ لندن کے تاجر سڑکوں اور تنگ گلیوں کے بجائے لین دین کا کام اس میں آرام سے کریں۔ ایک تاریخ داں کے مطابق انھیں ان سڑکوں اور کھلی تنگ گلیوں میں یا تو موسم کی شدت برداشت کرنی پڑتی تھی یا کہیں دکان میں پناہ لینی پڑتی تھی۔

اس حویلی نما عظیم الشان عمارت کا افتتاح ملکہ ایلزبیتھ نے 1571 میں کیا تھا۔ اپنے درباریوں اور امیروں کے ہمراہ ملکہ نے سر تھامس کے ساتھ طعام نوش فرمایا۔ کھانا اس کی بے انتہا دولت اور شان اور شان و شوکت کے مطابقت سے رکھتا تھا۔ لیکن شاہی جام صحت جو کھانے کے آخیر میں پیش کیا گیا سب سے زیادہ قیمتی تھا۔ سر تھامس نے ایک بہت ہی بیش بہا موتی میز پر رکھا اور اس کو پیس کر سفوف بنایا اور اس کو شراب میں ڈال کر ملکہ عالیہ کی صحت کے نام پر کھڑے ہو کو پی لیا۔

درباریوں اور سر تھامس کے ہمراہ ملکہ نے عمارت کا معائنہ کیا۔ ایک روایت کے مطابق ملکہ نے تمام عمارت کو دیکھا اور نقاروں اور شادیانوں کی گونج کے ساتھ اعلان کیا کہ اس عمارت کا نام رائل ایکسچینج رکھا جائے اور حکم دیا کہ عمارت کو کسی اور نام سے نہ پکارا جائے۔ □

□ حیدر شمسی

سائنس کو حرکت میں لانے والی عظیم شخصیت
اسحاق نیوٹن

آج سائنسی ترقی کے جو کمال ہمیں ہر طرف دکھائی دیتے وہ نہ جانے کتنے عالموں اور سائنس دانوں کی ہزاروں سال کی ان تھک کوششوں کا نتیجہ ہیں۔مگر ان عالموں اور سائنس دانوں میں چند ایسے بھی ہیں جنھوں نے سائنسی تلاش و جستجو کو آگے بڑھانے والی بنیادی باتیں ہمیں بتائیں اور جن کے بتائے گئے اصولوں کی بنیاد پر ہی آج سائنسی ترقی کی عظیم الشان عمارت کھڑی ہوئی ہے۔ ان سائنس دانوں میں ہم فیثا غورس Pythagoras بقراط Hippocrates ،ارسطو Aristotle،سقراط Socrates،افلاطون Plato، اقلیدس Euclid،ارشمیدس Archimedes، حکیم ابن سینا Avicenna نکولاس کوپر نکس Nicolaus Copernicus ، چارلس ڈارون CharlesDarwin ،تھامس ایڈیسن Thomas Edison،لوئی پاسچر Louis Pasteur،سر جگدیش چندر بوس، مارکونی Marconi اور البرٹ آئنسٹائن Albert Einstein کے نام لے سکتے ہیں جنھوں نے سائنس کے الگ الگ شعبوں کی بنیادی حقیقتوں کا پتہ لگایا۔ ان ہی میں ایک تھے سر آئزک نیوٹن Isaac Newton جنھوں نے کائنات میں موجود سورج ، زمین اور چاند جیسے ستاروں اور سیاروں کے آپس کے تعلق اور ان کی کشش ثقل Gravitational Force کا پتہ لگایا۔ مگر ان کی سب سے بڑی دریافت تھی 'حرکت کے تین اصول' یا Laws of Motion جس نے کائنات سے متعلق سائنس دانوں کی سوچ کو ایک دم بدل کر رکھ دیا۔ 'بچوں کی دنیا' کے آنے والے شماروں میں ہم ان سبھی سائنس دانوں کے بارے میں الگ الگ مضامین شامل کرنے کی کوشش کریں گے۔ فی الحال آپ سر آئزک نیوٹن کے بارے میں پڑھیے۔آئزک یا ایزاک ، عبرانی زبان Hebrew کا لفظ ہے جسے عربی میں اسحاق بولا جاتا ہے۔ اعزازی مدیر

اسحاق نیوٹن کی پیدائش 25 دسمبر 1642 میں لنکن شائر انگلستان میں ہوئی۔ وہ ماں کے پیٹ میں ہی تھے کہ اُن کے والد کا انتقال ہوگیا جو پیشے سے کسان تھے۔ نیوٹن کے والد کا نام بھی اسحاق نیوٹن تھا جس کا علم انھیں کئی سال بعد ہوا۔

پیدائش کے وقت نیوٹن بہت ہی کمزور تھے۔ان کی والدہ کہتی تھیں کہ نیوٹن کو ایک کھانے کی ہانڈی میں با آسانی رکھا جا سکتا تھا۔وہ اتنے کمزور پیدا ہوئے تھے کہ نرس نے ان کی زندگی کی میعاد صرف ایک دن بتائی تھی۔نیوٹن کی والدہ انھیں کسان بنانا چاہتی تھی لیکن ان کو کھیتی باڑی سے بالکل بھی دلچسپی نہیں تھی۔اُن کی والدہ انھیں ہر سنیچر کو 'گرینتھم مارکیٹ' میں اناج بیچنے کے لیے بھیجا کرتی تھی۔وہ دونوکروں کے ساتھ جاتے اور راستے ہی میں کسی درخت کے سائے میں بیٹھ جاتے تھے اور نوکروں سے کہتے جاؤ اناج بیچ کر جب واپس آنا تب مجھے ساتھ لیتے چلنا،لیکن والدہ سے اس بات کی شکایت مت کرنا اور پھر وہ اپنی پڑھائی میں مشغول ہو جاتے تھے۔اُن کے ماموں نے جب ان کا پڑھائی میں اس قدر انہماک دیکھا تب اُن کی ماں سے درخواست کی کہ انھیں گاؤں سے باہر اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیج دیا جائے۔ماموں کے مشورے پر انھیں English Grammar سیکھنے کے لیے اسکول (چرچ) میں داخل کر دیا گیا۔چونکہ اسکول گھر سے کافی دور تھا اس لیے انھیں ہاسٹل میں رہنا پڑا۔جس کی وجہ سے اُن کی صحت میں گراوٹ آ گئی۔ہاسٹل میں رہ کر پڑھنا کافی مشکل تھا کیوں کہ سارے کام انھیں خود ہی انجام دینے پڑتے تھے۔جب نتیجہ نکلا تو انھیں بہت افسوس ہوا۔کیوں کہ اُن کا شمار نا کاموں کی لسٹ میں تھا۔وہ کافی دل برداشتہ ہو گئے اور واپس گھر آ گئے۔جب اُن کے ماموں کو یہ پتہ چلا تو وہ ان کے گھر آئے اور انھیں سمجھایا کہ اتنی جلدی ہار نہیں ماننا چاہئے۔ماموں کے کافی اصرار کے بعد وہ دوبارہ اسکول جانے پر راضی ہو گئے۔اس بار ہاسٹل میں ان کا سابقہ ایک بہت اچھے پروفیسر سے پڑا جو اسی اسکول میں پڑھایا کرتے تھے۔اب کی بار انہیں دُگنا فائدہ ہوا اور وہ اس بار اچھے نمبر سے پاس ہو گئے۔

کہتے ہیں کہ اگر نیوٹن نے ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر پڑھائی نہ کی ہوتی تو شاید انسان کا چاند پر قدم رکھنے کا خواب تا قیامت ادھورا رہتا۔ایک مرتبہ کی بات ہے وہ سیب درخت کے نیچے بیٹھے مطالعہ کر رہے تھے کہ اچانک ایک سیب ان کے سر پر آ گرا۔ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید یہ سوچتا کہ ظاہری بات ہے کہ جب درخت سے سیب گرے گا تو زمین کی طرف ہی آئے گا۔انھوں نے اپنی چھٹی حس کی طرف توجہ دی اور غور کیا کہ زمین میں کوئی ایسی طاقت ضرور ہے جو ہر چیز کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور انھوں نے اس قوت کا نام قوت کشش ثقل رکھا جس کے بہت سے پہلوؤں پر آج بھی سائنس داں ریسرچ کر رہے ہیں۔ان کے اسی نظریہ کی بنیاد پر سیاروں کی گردش کو سمجھنے میں مدد ملی۔انھوں نے بتایا کہ وہ قوتِ کشش ہی ہے جو انسان کو زمین کا قیدی بنائے ہوئے ہے اور ساتھ ہی انھوں نے حساب لگا کر یہ تھیوری بھی تیار کی کہ اگر ہم ایک ایسی سواری تیار کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں جس کی رفتار سات میل فی سیکنڈ ہو تو ہم زمین کی قوتِ کشش سے آزاد ہو کر چاند پر پہنچ جائیں گے۔آخر ان کی موت کے تقریباً ڈھائی سو سال بعد وہ وقت آیا جب اُن کے نظریہ کے مطابق انسان نے ایک ایسی سواری بنائی جو سات میل فی سیکنڈ کے حساب سے حرکت کرتی تھی اور یوں 20 جولائی 1969 کو انسان نے چاند پر پہلی بار قدم رکھا۔ اب انسان دوسرے سیاروں پر بھی قدم رکھنے کی کوشش میں ہے تا کہ پتہ لگا سکے کہ کیا کسی اور سیارے پر بھی زندگی موجود ہے۔ہمارے منگل یان کی حالیہ کامیابی بھی اسی کوشش کا ایک حصہ تھی۔

نیوٹن علم ریاضی Mathmetics میں مہارت رکھتے تھے۔ جب ان کے ماموں کو اس کا اندازہ ہوا تو انھوں نے ان کی والدہ سے کہا کہ انھیں کیمبرج یونیورسٹی بھیجنا چاہیے۔ لہٰذا 5 جون 1661 کو وہ کیمبرج روانہ ہوئے۔ ایک روز ایک پروفیسر صاحب منطق کی ایک کتاب شروع کرنے والے تھے لیکن اسحاق نیوٹن نے اس کتاب کو پروفیسر صاحب کے پڑھانے سے قبل ہی شروع تا آخر پڑھ ڈالا۔ جب پروفیسر صاحب کلاس میں پڑھانے لگے تب انھیں احساس ہو گیا کہ نیوٹن تو پہلے ہی سے سب کچھ جانتا ہے۔ لہٰذا پروفیسر صاحب نے نیوٹن سے کہا کہ اس کتاب کے لیے تمھیں لیکچر میں بیٹھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ انھوں نے 27 سال کی عمر ہی میں سائنس کی دنیا میں ہلچل مچادی۔ نیوٹن نے پہلی بار روشنی کو آئینے کی مدد سے منعکس کر کے بہت دور کی چیزیں دکھا سکنے والی نئے طرز کی دوربین (ٹیلی اسکوپ) ایجاد کر کے علم فلکیات میں تہلکہ مچادیا۔ انھوں نے بتایا کہ حقیقت میں نظر آنے والی سفید روشنی سات رنگوں کا مجموعہ ہے۔ انھوں نے روشنی کے قانون کی مدد سے روشنی منعکس کرنے والی پہلی دوربین کا نقشہ اور ڈھانچہ تیار کیا۔ آج تک یہ دوربین علم فلکیات کے مشاہدات کے لیے کام آتی ہے۔

انگلستان کے مشہور شاہی ماہر فلکیات ایڈمنڈ ہیلی کو ایک دُم دار ستارے کے چکر لگانے کا صحیح حساب نہیں مل رہا تھا۔ تب انھوں نے نیوٹن سے ملاقات کی۔ جب انھوں نے نیوٹن سے اپنی پریشانی کے متعلق بتایا تو انھوں نے کہا کہ اس کا حساب میں پہلے ہی لگا چکا ہوں اور کاغذ ڈھونڈنے لگے لیکن اتفاق سے وہ کاغذ انھیں نہیں ملا۔ ہیلی نے سوچا کہ نیوٹن نے اپنے علم کا رعب جمانے کے لیے مجھ سے جھوٹ بولا ہے۔ لیکن جب نیوٹن نے نئے سرے سے ہیلی کے سامنے حساب لگانا شروع کیا تو ہیلی دم بخود رہ گئے۔ انھوں نے نیوٹن سے کہا کہ جو کچھ بھی تم نے سائنس سے متعلق لکھا ہے انھیں چھپوا دو اور جو بھی سرمایہ اس کام میں لگے وہ میں دینے کو تیار ہوں۔ ہیلی کی پیش کش کو اس وقت تو نیوٹن نے رد کر دیا، لیکن بعد میں ہیلی کے دباؤ اور کافی اصرار کے بعد وہ راضی ہو گئے۔ انھوں نے دو سال تک لکھنے پر کافی محنت کی۔ وہ رات کو دو دو بجے تک لکھتے رہتے۔ کبھی کچھ لیٹے لیٹے یاد آجاتا تو اٹھ بیٹھتے اور لکھنے لگتے۔ جب دو چار گھنٹے گزر جاتے تب انھیں خیال آتا کہ قریب رکھی کرسی کھینچ کر اس پر بیٹھ جاؤں۔ کبھی کبھار لکھنے میں اس قدر منہمک ہو جاتے کہ کھانا تک بھول جاتے۔ اس طرح بالآخر انھوں نے کتاب تیار کر لی۔ اس کتاب کی ٹکر میں تین سو سال تک کوئی دوسری کتاب کسی سائنسی موضوع پر نہیں چھپی۔ کتاب کا نام 'پرنسیپیا' Principia ہے جو تین کتابوں پر مشتمل ہے۔ تین سو سال بعد ڈاکٹر آئن سٹائین نے ایک کتاب لکھی جو 'پرنسیپیا' کے ٹکر کی مانی جاتی ہے۔

31 مارچ 1727 کو سر اسحاق نیوٹن کا انتقال ہو گیا۔ انھیں 'ویسٹ منسٹر' کے گرجا گھر میں دفن کیا گیا۔ وہ پہلے سائنس داں تھے جنھیں یہ اعزاز حاصل ہوا۔ □

Haider Shamsi,Govindi , Mumbai-400043

کہانی

□ محمد اطہر مسعود خاں

میٹھا ناسور

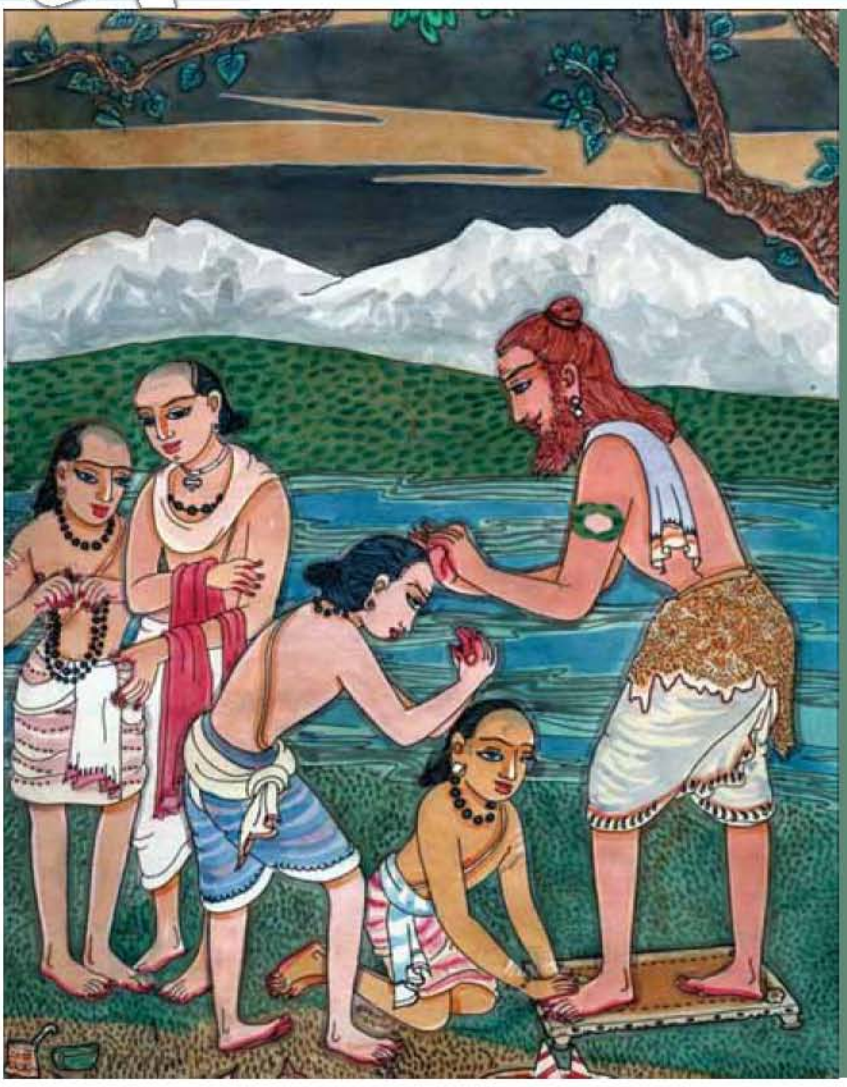

استاذ سے محبت کی ایک جذباتی کہانی

بہت وقت گزرا، ہمارے ملک میں ایک گرو جی رہتے تھے۔ اس وقت کے بڑے بڑے لوگ ان کو اپنا گرو مانتے اور ان کی بڑی سیوا کرتے۔ دور دور سے طالب علم ان کے پاس علم حاصل کرنے آتے تھے۔ گرو جی ان سب سے بہت محبت کرتے۔ گرو جی کو، اپنے طالب علموں کو پڑھاتے ہوئے برسوں گزر گئے۔ وقفہ وقفہ سے نئے طلبا، ان کے پاس آتے رہتے اور بہت سے فارغ ہو کر یعنی تعلیم مکمل کر کے اپنے گھروں کو لوٹ جاتے۔

ایک دن اچانک ان کی طبیعت خراب ہوگئی اور وہ اپنی چارپائی پر لیٹ کر کراہنے لگے۔ ان کی درد بھری اور کراہنے کی آواز سن کر ان کے سبھی چیلے اور طلبا دوڑے دوڑے ان کے پاس آ گئے اور پوچھنے لگے کہ گرو جی آپ کو کیا تکلیف ہے، جو اچانک اتنی زور سے کراہ رہے ہیں۔

لیکن گرو جی نے انہیں ہاتھ کے اشارے سے باہر جانے کو کہا۔ وہاں موجود سبھی لوگ حیران پریشان تھے اور اپنے پیارے گرو جی کی تکلیف سے بہت دکھی ہو رہے تھے۔ گرو جی کا درد تھا کہ برابر بڑھتا جا

رہا تھا اور ساتھ ہی ان کی کراہیں بھی تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ان کے چیلوں نے ان سے اصرار کیا کہ آپ یہ تو بتایئے، آپ کے کس جگہ درد یا تکلیف ہے۔گرو جی اپنے چیلوں سے بہت محبت کرتے تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ ان کے چیلے بے وجہ پریشان اور دکھی ہوں۔لیکن ان کے چیلوں کا جب اصرار بڑھا تو انہوں نے اپنے بازو کو پکڑتے ہوئے کہا: ''اب کچھ نہیں ہوسکتا۔ میں نے تم لوگوں سے اپنی تکلیف کو بہت دن تک چھپائے رکھا اور میرے بازو میں جو پھوڑا نکلا تھا، وہ بس اب پھوٹنے ہی والا ہے اور یہ جلن اور آگ اسی پھوڑے کی وجہ سے ہے۔''

''مگر آپ نے تو ہمیں اس بارے میں کیوں نہیں بتایا۔'' کئی چیلوں نے دکھی اور حیران ہوتے ہوئے کہا۔

''دیکھو بچو! گرو یا ماں باپ ہرگز نہیں چاہتے کہ ان کے بچے، ان کی وجہ سے پریشان ہوں۔اس لیے وہ اپنے دکھ درد کو خاموشی سے برداشت کرتے رہتے ہیں اور کسی سے کچھ نہیں کہتے۔''

''لیکن اس پھوڑے کا علاج تو ہونا ہی چاہیے۔'' ان کے کئی چیلوں نے فوراً جواب دیا: ''ہم کوشش کرتے ہیں کہ کوئی وید یا حکیم مل جائے تو اسے لے کر آپ کے پاس آئیں اور اس پھوڑے کا علاج کرائیں۔''

''بچو!'' گرو جی نے شفقت سے کہا: ''کل رات جب تم سب لوگ جا چکے تھے، میں نے اپنے ایک سیوک سے وید جی کو بلوایا تھا۔ انہوں نے ہی یہ تکلیف دہ بات کہی کہ یہ پھوڑا ناسور بن چکا ہے اور اس میں سے زہر رسنے لگا ہے۔ڈر ہے کہ اگر اس زہر کو پھوڑے سے باہر نہ نکالا جائے تو یہ زہر پورے جسم میں پھیل جائے گا، جس سے میری زندگی کو بہت خطرہ ہے۔''

گرو جی کی بات سن کر سارے چیلے پریشان ہوگئے۔وہ چاہتے تھے کہ چاہے کچھ بھی ہو لیکن ہمارے گرو جی کی جان بچ جائے کیونکہ ان کی ذات سے سیکڑوں لوگوں کو تعلیم و تربیت حاصل ہوتی تھی۔

''وید جی نے اس کا کیا علاج بتایا؟'' ایک چیلے نے ہمت کر کے گرو جی سے پوچھا۔

''انہوں نے علاج تو بتایا ہے لیکن...'' گرو جی آگے کہتے کہتے رک گئے۔

''لیکن کیا گرو جی! ہمیں پوری بات بتایئے۔ہم آپ کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہیں۔'' ان کی ایسی حالت دیکھ کر کئی چیلوں نے بڑے جوش کے ساتھ کہا۔

''افسوس! میرے بچو، اب کچھ نہیں ہوسکتا کیونکہ اب بہت دیر ہو چکی ہے۔'' گرو جی نے مایوسی سے اپنے چیلوں کو دیکھتے ہوئے کہا: ''اب موت کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں۔شاید کل تک یہ کٹیا ویران ہو جائے گی۔'' گرو جی نے بھیگی پلکوں سے اپنے بہت پیارے چیلوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

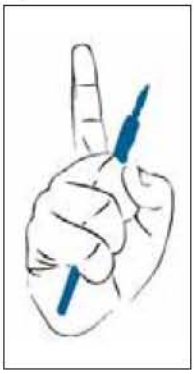

''ایسا مت کہیے گرو جی! ہمارے ہوتے ایسا نہیں ہوسکتا۔ہم آپ کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہیں۔'' اس اداس اور غمگین ماحول میں کئی چیلوں نے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے ایک زبان ہو کر کہا۔

''میرے پیارے چیلو! وہ علاج بھی ایسا خطرناک اور تکلیف دہ ہے کہ تم اسے سن کر بے چین اور پریشان ہو جاؤ گے۔''

چیلوں سے بھی نہ رہا گیا۔ان میں کئی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا وہ کس طریقہ سے اپنے گرو جی کی جان بچانے کی کوشش کریں۔انہوں نے جوش میں آتے ہوئے کہا: ''گرو جی! ہمیں آپ کی زندگی اپنی جان سے بھی زیادہ پیاری ہے۔ہم آپ کے لیے ہر قربانی دینے کو تیار ہیں۔''

''جب تم لوگ اتنے بے چین اور پریشان ہو اور میرے لیے اپنی جان قربان کرنے کو بھی تیار ہو تو سنو!'' گرو جی یہ کہہ کر پھر رک گئے۔ انہوں نے بے بسی سے اپنے چیلوں کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا: ''وید جی کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنے منہ سے اس پھوڑے کا زہر چوس لے تو آپ کی جان بچ سکتی ہے۔لیکن...''

گرو جی کے یہ بتانے سے چیلے اور زیادہ پریشان ہو گئے لیکن اسی درمیان گرو جی نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے آگے کہا: ''پریشانی یہ ہے کہ جو شخص بھی پھوڑے سے اس زہر کو چوس لے گا، زہر سے اسی وقت اس کی موت ہو جائے گی۔''

گرو جی کی بات سن کر سارے چیلے حیران رہ گئے۔ وہ پریشانی سے ایک دوسرے کا منھ تکنے لگے۔ موقع ملتے ہی کئی چیلے تو الگ الگ بہانے کر کے، خاموشی سے وہاں سے کھسک لیے اور وہاں پر گرو جی کے چند ہی چیلے باقی رہ گئے لیکن ان بھی بظاہر ایسا کوئی نظر نہ آتا تھا جو گرو جی کے پھوڑے سے زہر چوس کر اپنی جان کا نذرانہ پیش کرتے ہوئے گرو جی کی جان بچالے۔

اس صورت حال میں گرو جی نے بھی اپنا لہجہ تلخ کر لیا۔ وہ جو ہر وقت پیار، محبت اور شفقت سے، اپنے چیلوں سے پیش آتے تھے، اس وقت نالاں اور شدید ناراض دکھائی دے رہے تھے۔ وہاں موجود چیلے جنھیں وہاں سے کھسک لینے کا موقع نہ مل سکا تھا، خاموشی سے منھ لٹکائے کھڑے تھے کہ اسی درمیان گرو جی نے غصے سے کہا: ''میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ اس پھوڑے کا علاج بہت مشکل ہے۔ اسی وجہ سے تو میں تم لوگوں کو اپنی بیماری کے بارے میں نہیں بتا رہا تھا۔'' انہوں نے تکلیف سے کراہتے ہوئے آگے کہا: ''مگر خیر کوئی بات نہیں۔ کوئی گرو کبھی اپنے کسی چیلے کی جان نہیں لیتا بلکہ اپنی جان ہی اس پر قربان کرتا ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ میں بھی کسی کی جان لینے کے بجائے خود تم پر اپنی زندگی قربان کر دوں۔ پھوڑا اب پھوٹنے ہی والا ہے، جس سے یقیناً میری زندگی کو خطرہ ہے۔''

لیکن ان شاگردوں اور چیلوں میں دبلا پتلا اور نہایت غریب ایک ایسا چیلا بھی تھا جو چاہتا تھا کہ گرو جی پر اپنی جان نثار کر دے۔ اس سے گرو جی کی تکلیف دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ ادھر گرو جی درد اور پھوڑے میں مچی آگ کی وجہ سے تڑپ رہے تھے۔ اسی درمیان اس چیلے نے گرو جی کے ہاتھوں کو چومتے ہوئے کہا: ''میں آپ کے پھوڑے کا زہر چوس لوں گا اور اپنی جان آپ کے اوپر قربان کر دوں گا چیلے اور شاگرد تو سیکڑوں، ہزاروں جنم لیتے ہی رہتے ہیں لیکن ایک مہان گرو برسوں بلکہ صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔ ابھی آپ کو اور بھی علم کی روشنی پھیلا کر سماج کی خدمت کرنی ہے۔ اس لیے آپ کی جان بہت قیمتی ہے۔''

اس چیلے کی، گرو جی کی حالت دیکھ کر روتے روتے ہچکی بندھ گئی تھی۔ وہ جذباتی لہجے میں پھر بولا: ''میں اپنے گرو کے لیے اپنی جان قربان کر دوں اس سے بڑی خوش نصیبی میرے لیے اور کیا ہو سکتی ہے!''

''تم...! تم یہ زہر پیو گے؟ نہیں بیٹے! تم تو خود اس قدر کمزور اور دبلے پتلے ہو اور پھر یہ کہ تم اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد ہو۔ تمہاری جان لے کر میں تمہارے ماں باپ کو کیا جواب دوں گا اور کیسے ان کو اپنا منھ دکھاؤں گا۔''

گرو جی نے اپنے قدموں میں بیٹھے شاگرد کو بہت سمجھایا۔ پیار سے اس کے سر ہاتھ پھیرا۔ اس کو دعائیں دیں۔ اس سے کہا کہ وہ ان کا زہر نہ پیے اور اپنی زندگی کو ختم نہ کرے لیکن وہ چیلا اپنے گرو کی یہ بات ماننے کے لیے کسی صورت سے تیار نہ ہوا۔

مجبور ہو کر گرو جی نے کپڑا ہٹایا اور پٹی بندھا ہوا بازو اس کے آگے کر دیا اور کراہتے ہوئے انگلی سے اسے بتایا کہ یہ ہے وہ موٹا پھوڑا جس میں زہر بھرا ہوا ہے اور یہ ہے اس کا چھوٹا سا منھ جس میں سے مواد اور زہر باہر نکلنے ہی والا ہے۔

گرو، گوبند دونوں کھڑے، کس کے لاگوں پائے
بل ہاری گرو آپ کے، گوبند دیو بتائے
کبیر

چیلے نے ہمت کر کے گرو جی کی بتائی جگہ پر اپنے ہونٹ رکھ دیے اور آہستہ آہستہ اس زخم سے زہر چوسنے لگا۔ وہ اپنی خوش نصیبی سمجھ رہا تھا کہ آج وہ اپنی جان قربان کر کے گرو جی کی زندگی ضرور بچا لے گا۔ گرو جی کے منھ سے درد کے مارے کراہیں نکل رہی تھیں لیکن وہ آہستہ آہستہ پھوڑے کو آس پاس سے دبا رہے تھے اور اس کا زہر ان کا شاگرد منھ لگائے چوس رہا تھا۔ آخر دباتے دباتے جب پھوڑے کی سوجن بالکل ختم ہو گئی تو شاگرد نے آہستہ سے اپنا منھ اس زخم سے ہٹا لیا۔

تبھی گرو جی نے اس سے پوچھا: ''بیٹا! زہر کا ذائقہ کیسا تھا؟''

وہاں کھڑے سبھی چیلے یہ سوچ رہے تھے کہ بس اب چند ہی منٹوں میں اس شاگرد کی زندگی ختم ہو جائے گی کیونکہ پھوڑے کا سارا زہر اب اس کے جسم میں پہنچ چکا تھا۔

گرو جی نے فخر کے ساتھ اس چیلے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے بہت سی دعائیں دیں۔ پھر گرو جی نے آہستہ آہستہ پٹی ہٹاتے ہوئے چیلے سے پوچھا: ''بیٹا! تم نے بتایا نہیں کہ زہر کیسا تھا؟''

''بہت میٹھا!'' چیلے نے گرو جی کے اُجلے روحانی چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے کہا ''آپ کے اوپر میری زندگی قربان ہو جائے تو یہ میری خوش نصیبی ہوگی۔''

اسی درمیان گرو جی نے اپنے بازو پر بندھی پٹی پوری طرح ہٹا دی سبھی چیلے پھوڑے والی جگہ کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ انہوں نے گھبرا کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ ان کے سر ندامت اور شرم سے جھک گئے تھے کیونکہ بازو پر نہ کوئی زخم تھا اور نہ پھوڑا۔ گرو جی تو محض اپنے چیلوں کا امتحان لے رہے تھے اور انہوں نے بازو پر صرف ایک چھوٹا سا رس دار پکا ہوا پھل باندھ دیا تھا جس کا رس اس چیلے نے چوس لیا تھا۔

گرو جی نے بڑے جذباتی انداز میں آنسوؤں سے بھری آنکھوں کے ساتھ اپنے اس پیارے چیلے کو گلے سے لگا لیا۔ وہ رندھے گلے سے کہہ رہے تھے: ''دنیا میں ماں باپ کے بعد سب سے بڑا رتبہ استاد کا ہے۔ جو لوگ خدمت کرتے اور قربانی دیتے ہیں، کامیابی ان ہی کے قدم چومتی ہے۔''

کچھ دیر خاموش رہ کر انھوں نے کہا: ''آج سے یہی چیلا میرا جانشین ہوگا۔'' □

Dr M Athar Masood Khan
Ghaus Manzil, Talab Mulla Iram Rampur-244901 UP

کہانی

آصف جلیل احمد

پہلی غلطی آخری غلطی

"حسن بیٹا، ذرا دوکان سے ایک کلو چینی لے آؤ" امی نے حسن کو دیکھ کر بلند آواز میں کہا۔

حسن اس وقت کھیل کر گھر میں داخل ہو رہا تھا۔ "جی امی! ابھی جاتا ہوں" اُس نے جواب دیا، اور گھر سے کچھ ہی دور دوکان کی طرف چل پڑا۔ دوکان پر پہنچ کر اُس نے ایک کلو چینی کا آرڈر دیا۔

دوکاندار حسن کی بات سن کر مڑا اور دوکان کے اندرونی حصے کی طرف چینی لینے کے لیے چلا گیا۔ اسی دوران حسن کی نگاہ دوکان میں سامنے ریلنگ پر رکھے ایک ڈبہ پر پڑی جس میں رنگ برنگے کیک بھرے تھے۔

حسن اس وقت بھوکا تھا۔ نہ جانے اسکے دل میں کیا خیال آیا کہ دوکاندار جیسے ہی دوسری طرف مڑا جلدی سے ایک کیک اٹھایا اور منہ میں ڈال کر نگلنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی دوران دوکاندار واپس آ گیا، اور حسن کو ایک کلو چینی دے دی۔ اُس نے چینی لے کر رقم ادا کی، اور گھر کی طرف چل پڑا۔

حسن دل ہی دل میں خوش تھا کہ دوکاندار اس کی چوری کو نہیں دیکھ سکا، اور اُس نے کیک مفت میں اس نے کھا لیا۔ کیک کا ذائقہ حسن کو بہت اچھا لگا، لیکن اسے محسوس ہو رہا تھا کہ جب سے اس نے کیک کھایا ہے اسکے گلے میں کوئی چیز پھنس سی گئی ہے۔ حسن گھر پہنچا، ماں کو چینی تھمائی اور ایک کمرے میں موجود آئینے کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے اپنا منہ کھولا اور آئینے کی مدد سے گلے میں جھانکنے لگا،

کہ وہ کون سی چیز ہے جو اس کے گلے میں پھنس گئی ہے۔ اب تو گلے میں درد بھی ہونے لگا تھا۔ حسن زور لگا کر پورا منہ کھولنے کی ناکام کوشش کرتا رہا، مگر اسے کوئی چیز نظر نہیں آئی۔

ابھی وہ آئینے کے سامنے کھڑے منہ کھولے دیکھ ہی رہا تھا کہ اچانک حسن کی امی کمرے میں داخل ہوئیں اور حسن کو یوں منہ کھولے آئینے کے سامنے کھڑا دیکھ کر حیران ہوگئیں۔ انھوں نے پوچھا، ''اس طرح منہ کھولے آئینے کے سامنے کھڑے کیا دیکھ رہے ہو۔''

حسن اپنی امی کو سامنے دیکھ کر گھبرا گیا، اور بولا، ''نہیں امی، بس ویسے ہی کھڑا ہوں۔''

ابھی حسن نے بس اتنا ہی کہا تھا کہ اسے یوں لگا جیسے گلے کو کسی نے تیز دھار آلے سے کاٹ دیا ہو۔ حسن وہیں زمین پر لوٹ پوٹ ہوگیا۔

حسن کی امی یہ دیکھ کر گھبرا گئیں کہ اچانک میرے بیٹے کو کیا ہوگیا ہے؟ امی نے جلدی سے حسن کو سیدھا کر کے بستر پر لٹایا اور پوچھا ''کیا ہوا ہے بیٹا؟''

حسن مسلسل چیخے، چلائے جا رہا تھا۔ اس کے گلے سے عجیب و غریب آوازیں نکل رہی تھیں۔ منہ سے ہلکا سا خون بھی باہر نکل رہا تھا۔ اب حسن کو یقین ہوگیا تھا کہ اس کے گلے میں کوئی چیز موجود ہے جس کی وجہ سے اس کی یہ حالت ہوگئی ہے۔ اُس کی امی یہ سب دیکھ کر سٹپٹا گئیں اور زور زور سے سب گھر والوں کو آوازیں دینے لگیں۔ حسن کے ابو، دادا، دادی، بہن، بھائی سب دوڑے چلے آئے، اور لڑکے کی حالت دیکھ کر سب گھبرا گئے۔ حسن کے دادا نے جلدی سے پانی منگوایا اور اُسے بہت سا پانی پلایا لیکن کچھ افاقہ نہ ہوا۔ حسن کا درد ویسا ہی رہا۔ اس کی حالت غیر ہو رہی تھی، اور وہ دل ہی دل میں اس وقت کو کوس رہا تھا، جب اس نے چوری چھپے وہ کیک کھایا تھا۔

دادی اماں نے ایک روٹی کا ٹکڑا منگوایا اور حسن کے منہ میں ڈال دیا۔ مگر حسن نے اس روٹی کے ٹکڑے کو باہر اگل دیا۔ اس سے کچھ بھی نہیں کھایا جا رہا تھا۔

تب حسن کے ابو نے سختی سے پوچھا، ''حسن سچ سچ بتاؤ کیا کھایا تھا جس کی وجہ سے یہ حالت ہو رہی ہے۔'' حسن نے جب یہ دیکھا کہ اب بتانے کے سوا کوئی چارہ نہیں، تو اس نے روتے ہوئے شرمندہ لہجے میں سب کو بتا دیا کہ اس نے دوکاندار کی نظروں سے بچ کر ایک کیک کھایا تھا تب سے اس کے گلے میں کوئی چیز پھنس گئی ہے۔

حسن کے ابو نے ایک خشک روٹی کا بڑا سا ٹکڑا منگوایا اور اسے نگلنے کا حکم دیا۔ حسن نے بہت انکار کیا، مگر اس کی ایک نہ چلی۔ مجبوراً اس نے وہ ٹکڑا منہ میں رکھا اور اسے نگلنے کی کوشش کرنے لگا۔ حسن کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ وہ برے برے منہ بنا رہا تھا، اور دل میں اپنے آپ پر لعن طعن کر رہا تھا کہ کاش وہ کیک کھانے کی غلطی نہ کرتا۔

حسن مسلسل اس خشک روٹی کے ٹکڑے کو نگلنے کی کوشش کر رہا تھا، کہ اچانک اسے زوردار ابکائی آئی اور مسلسل قے شروع ہو گئی۔ جیسے ہی قے رکی، حسن کو گلے میں کچھ سکون محسوس ہو، اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اب اسکے گلے میں کوئی چیز نہیں ہے۔ اب اسے درد بہت کم محسوس ہو رہا تھا۔ حسن کے ابو غور سے اس قے کو دیکھ رہے تھے کہ آخر کیا چیز حسن کے گلے میں پھانس بن کر تکلیف دے رہی تھی۔

اچانک حسن کے ابو کو کسی کالی سی چیز کے ٹکڑے نظر آئے، غور سے دیکھنے پر پتا چلا کہ یہ چیونٹے کا پچھلا حصہ ہے اور یہی چیونٹا حسن کے گلے میں پھنس گیا تھا۔ اسی کے کاٹنے کی وجہ سے حسن کی حالت غیر ہو گئی تھی۔ چیونٹے کو دیکھ کر یہ بات سب کی سمجھ میں آ گئی تھی کہ جب حسن نے جلدی سے کیک اٹھا کر منہ میں ڈالا تھا، تو اس وقت وہ چیونٹا پہلے سے اس کیک پر بیٹھا تھا۔ وہ بھی کیک کے ساتھ حسن کے منہ میں چلا گیا، لیکن پیٹ میں جانے کی بجائے حلق میں پھنس کر رہ گیا، اور باہر نکلنے کی مسلسل کوشش کرنے لگا جس کی وجہ سے حسن کو یہ سب کچھ جھیلنا پڑا۔ حسن کو اس کے کیے کی سزا مل چکی تھی۔ وہ سب گھر والوں کے سامنے نادم کھڑا تھا۔

ابو نے حسن کو گلے سے لگا لیا سچ بولنے پر شاباشی دیتے ہوئے اسے معاف کر دیا۔ لیکن اس سے یہ وعدہ بھی لیا کہ آئندہ حسن کبھی ایسی حرکت نہیں کرے گا۔

اگلے دن جب حسن کی حالت کچھ سنبھل گئی تو اس کی امی نے حسن کو پانچ روپے دیے اور کہا کہ جاؤ یہ دکاندار کو دے آؤ، یہ اس کیک کی قیمت ہے جو تم نے کل کھایا تھا۔ حسن دوکان پر چلا گیا اور دکاندار سے کہا، ''معاف کیجیے انکل، کل آپ کی دوکان سے میں نے غلطی سے کیک کھایا تھا۔ اس کے پیسے لے لیجیے۔''

حسن نے جیب سے نوٹ نکال کر دوکاندار کی طرف بڑھا دیا۔ دوکاندار حسن کی اس ایمانداری کو دیکھ کر بہت خوش ہوا اور سامنے پڑے ہوئے اسی کل والے کیک کی طرح ایک اور کیک نکال کر حسن کی طرف بڑھا دیا اور کہا، ''یہ کیک لے لو بیٹا، یہ میری طرف سے اس ایمانداری کا انعام سمجھ کر کھا لو۔''

حسن نے جیسے ہی کیک کو دیکھا اسے یوں لگا جیسے گلے میں پھر کوئی چیز پھنس گئی ہو۔ وہ کیک لیے بغیر گھر کی طرف بھاگ گیا۔

دوکاندار حسن کو یوں بھاگتا دیکھ کر حیران ہوا اور سوچنے لگا کہ کتنا پیارا اور نیک بچہ ہے، ایسا بچہ آجکل کہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔

اُدھر حسن نے گھر پہنچ کر اطمینان کا سانس لیا اور دل میں تہیہ کر لیا کہ آئندہ وہ کبھی چوری نہیں کرے گا اور نہ ہی کبھی جلد بازی میں کوئی چیز کھائے گا۔ یوں حسن کی پہلی غلطی اس کی آخری غلطی بن گئی۔ □

Asif Jaleel Ahmed
34,Guruwar Ward,Chunabhatti,Malegaon
Dist:Nasik-423203 Maha.

کہانی

بوڑھے کوّے کی چالاکی

□امتیاز عالم

پرانے زمانے میں ایک بڑا جنگل تھا۔اس میں ہر طرح کے جانور اور چرند، پرند رہتے تھے۔اس جنگل میں کوّا اور اُلّو بہت بڑی تعداد میں تھے۔دونوں جنگل کے راجہ بننا چاہتے تھے۔اس کے لیے دونوں میں خاندانی دشمنی چلی آرہی تھی۔دن میں کوّا اپنا کام کرتا، روزی روٹی کی تلاش میں رہتا اور رات میں پیڑ کے اوپر اپنے گھر میں سوجاتا۔اس کے اُلٹ اُلّو رات بھر جاگتا، پیٹ بھرنے کے لیے رات میں مزدوری کرتا اور دن میں پہاڑ کے غار میں سوجاتا جہاں ان لوگوں کا اپنا گھر تھا۔لیکن یہ بات کوّے کو معلوم نہ تھی۔کوّا بہت چترا اور چالاک تھا، جلدی کسی کے چکر میں نہیں پھنستا تھا۔وہ اپنی قوم کی مدد سے اپنے آپ کو اس جنگل کا راجہ کہلواتا۔کوّے کا بول بالا ہوتا تو جنگل کے دوسرے پرندے اس کو اپنا راجہ مان لیتے اور جب کبھی اُلّو کوّے کو ہرا دیتا تو وہ اُلّو کو راجہ قبول کر لیتے۔

اُلّو طاقتور پرندہ ہوتا ہے۔اس لیے کوّے کی بادشاہت تسلیم نہیں کرتا ہے۔اُلّو کو اپنی طاقت کا اندازہ تھا۔وہ جب چاہتا کوّے کی قوم کے دو چار افراد کو گھائل کر دیتا اور دھمکی دیتا کہ اگر تم لوگ میرے ملک میں امن و شانتی سے نہیں رہو گے تو مار پیٹ کر یہاں سے باہر نکال دیے جاؤ گے۔کچھ دن کوّے ٹھیک ٹھاک رہتے۔جنگل میں امن و شانتی رہتی۔کوّے چند مہینے سکون سے رہتے پھر وہ دوسرے چڑیے کے بیچ جا کر مگرمچھ کے آنسو بہاتے اور اُلّو کے خلاف من گھڑت کہانی سناتے۔ جو پرندے کوّے کی مکاری کو سمجھتے، وہ اس کے جھانسے میں نہیں آتے ۔کوّے کی باتوں کو ایک کان سے سنتے اور دوسرے کان سے نکال دیتے لیکن پرندوں میں بھی سب ایک جیسے نہیں تھے۔ان میں کچھ ناسمجھ بھی تھے اور کچھ جذباتی بھی تھے۔وہ حقیقت جانے بغیر کوّے کے ساتھ ہو لیتے۔اس سے کوّے اپنے دل میں بہت خوش ہوتے۔

ایک دن کی بات ہے تمام اُلّوؤں کی ایک میٹنگ ہوئی۔اس

بات پر سبھوں نے اتفاق کرلیا کہ کوّے سب کو بھڑکاتا ہے۔ جو ہمارے ملک کے لیے بہت بڑا خطرہ ہے۔ اس لیے کوّے کو سبق سکھانا چاہیے۔ ہمیں ان پر پوری طاقت کے ساتھ حملہ کرنا چاہیے۔ اس کے لیے اگلی رات کے بارہ بجے کا وقت مقرر ہوا۔ الّو کوّوں کے سارے ٹھکانے سے واقف تھے۔ منصوبے کے مطابق کوّوں پر چوطرفہ حملہ ہوا۔ اس وقت کوّے اور جنگل کے دوسرے پرندے گہری نیند سو رہے تھے۔ اس حملے میں بہت سارے کوّے مارے گئے اور بہت سارے گھائل بھی ہوئے۔ کوّوں کے گھر بار جلادیے گئے۔ ہر طرف چیخ پکار مچ گئی۔ صبح ہوتے ہی کوّا برادری کی میٹنگ ہوئی۔ ان لوگوں نے الّو سے اس کا بدلہ لینے کی قسم کھائی لیکن طاقتور الّوؤں کو شکست دینا آسان کام نہیں تھا۔ پھر کوّے الّوؤں کی کمزوریوں سے بھی واقف نہیں تھے۔ الّوؤں کو ہرانے کے لیے طرح طرح کے مشورے دیے گئے۔ ایک بوڑھا کوّا بہت دیر سے چپ چاپ بیٹھا تھا۔ سب کی باتوں کو بہت غور سے سن رہا تھا۔ اسے کسی کی بھی رائے معقول نہیں لگی۔ وہ بھری محفل میں کھڑا ہوا اور کہنے لگا۔ ''اگر الّوؤں کو ہرانا ہے تو سب سے پہلے ان کی کمزوریوں کو ڈھونڈو۔ وہ کھاتا کب ہے، رہتا کہاں ہے، سوتا کب اور کب جاگتا ہے؟ پھر ان ہی کمزوریوں کو بنیاد بنا کر ان پر حملہ کرو۔''

ایک کوّے نے بوڑھے کوّے سے پوچھا۔ ''لیکن چچا یہ سب کیسے معلوم ہوگا؟''

بوڑھے کوّے نے جواب دیا۔ ''ہم میں سے کسی کو ان کے بیچ میں رہنا ہوگا۔ انھیں کی بولی بولنی ہوگی تاکہ وہ اپنا دوست سمجھنے لگیں۔ پھر ان کی قربت حاصل ہوجائے گی اور ان کے سارے راز جان کر ان پر حملہ بول دیں گے۔''

دوسرے کوّوں نے بوڑھے کوّے کی مخالفت کی۔ مگر کوّوں کا سردار بوڑھا اور تجربہ کار تھا۔ اس نے بوڑھے کوّے کی رائے کی

مخالفت کی اور بوڑھے کوّے کو ہی اس کام پر مقرر کر دیا۔ منصوبہ کے مطابق بوڑھے کوّے کے پنکھ نوچ دیے گئے۔ اس کے بعد اسے ادھ مرا کر کے الّوؤں کے راستے پر پھینک دیا گیا۔

الّوؤں کے قافلے کا ادھر سے گذر ہوا تو بوڑھے کوّے کو گھائل دیکھ کر پوچھا۔ یہ سب کیسے ہوا؟

بوڑھے کوّے نے روتے ہوئے جواب دیا۔ ”سرکار! سرکار!! میرا قصور صرف اتنا ہے کہ میں نے اپنی برادری کے لوگوں کو سمجھایا کہ آپ لوگوں کی بادشاہت مان لیں۔ وہ بہت مہان ہیں، طاقتور ہیں، ان میں راجہ بننے کی صلاحیت ہے۔ اس پر ہماری برادری کے لوگوں نے مجھے بہت مارا پیٹا ہے، آپ لوگوں کا جاسوس کہہ کر مجھے اپنی برادری سے باہر نکال دیا ہے۔ حق بات بولنے کا یہ انعام ملا ہے سرکار۔“

بوڑھے کوّے کی بات سن کر کچھ تجربہ کار الّوؤں نے کہا یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ دال میں کچھ کالا ہے۔ اس لیے اسے اس کی حالت پر چھوڑ دیں۔ کچھ جوشیلے الّوؤں نے کہا، اپنے وفاداروں کے ساتھ یہ سلوک اچھا نہیں ہوگا۔ ہمیں ان بڑے میاں کی مدد کرنی چاہیے۔ مدد کرنے کی نیت سے بوڑھے کوّے کو الّوؤں کے سردار کی محفل میں پہنچا دیا گیا۔ سردار نے بوڑھے کوّے سے سارا ماجرا سچ سچ سنانے کو کہا۔ بوڑھے کوّے نے اپنی جھوٹی وفاداری کی ساری باتیں سردار کو بتائیں جو اس سے پہلے کوّے کے قافلے کو بتائی تھیں۔ وہ اپنی چالاکی سے سردار کو یقین دلانے میں کامیاب ہو گیا۔ سردار نے بوڑھے کوّے کا علاج کرانے اور رہنے سہنے کی اجازت دے دی۔ اس کی خدمت کے لیے ایک نوکر کو لگا دیا گیا۔ بوڑھا کوّا دل ہی دل میں بہت خوش ہوا۔ یہ اس کی پہلی کامیابی تھی۔

بوڑھا کوّا اپنی برادری کے لوگوں کی حماقتوں اور بے وقوفیوں کا مذاق اڑایا کرتا۔اس سے الّو قوم بہت خوش ہوتی۔وہ اپنی میٹھی باتوں سے آہستہ آہستہ الّوؤں کے دربار تک پہنچ گیا۔وہ ان کے فیصلوں میں بھی شریک ہونے لگا۔ایک دن چپکے سے بوڑھا کوّا اپنی برادری کے سردار کے پاس آ گیا۔اور اس کی ساری کمزوریوں کو بیان کر دیا۔پھر بوڑھا کوّا واپس الّوؤں کے بیچ چلا گیا تا کہ انھیں اس پر کسی طرح کا شک نہ ہو۔

اس کے بعد کوّوں کے یہاں الّوؤں پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ان لوگوں کو پتہ چل گیا کہ الّو کو دن میں دکھائی نہیں دیتا ہے۔ اس لیے دن میں آسانی سے ان کو ہرا نہیں کامیاب ہو جائیں گے اگلے دن دوپہر کو حملے کا وقت مقرر ہوا۔الّو رات بھر جنگل میں گھومتے پھرتے رہے۔پھر وہ صبح ہوتے ہی اپنے اپنے گھروں میں سو گئے۔ بوڑھا کوّا انیند نہ آنے کا بہانہ کر کے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔اُدھر کوّوں نے سوکھی لکڑی جمع کر لیں۔آگ لگانے کے لیے ماچس بھی ساتھ میں رکھ لیں۔اپنے اوزار بھی ٹھیک کر لیے۔صبح ہوتے ہی دھیرے دھیرے سارے کوّے الّوؤں کی پہاڑ کے اردگرد چھپ کر بیٹھ گئے اور بوڑھے کوّے کے اشارے کا انتظار کرنے لگے۔بوڑھے کوّے کا اشارہ پاتے ہی وہ الّوؤں پر ٹوٹ پڑے۔ان کے سارے گھر لوٹ لیے گئے۔الّو طاقتور ہوتے ہوئے بھی آسانی سے مار کھاتا رہا۔کچھ کر نہیں پا رہا تھا۔پہاڑ کے ہر کھوہ کے دروازے پر پہلے ہی سے سوکھی لکڑی رکھ دیے گئے تھے۔باہر نکلتے ہی ہر دروازے پر رکھی لکڑی میں آگ لگا دی گئی۔الوؤں کے نکلنے کے سارے راستے بند ہو گئے ۔ اس لیے وہ اسی میں جل بھن کر مر گئے۔ایک بوڑھے کوّے کی چالاکی سے کوے برادری کو جیت ملی۔اس طرح کوّا برادری کو جنگل کا راج پاٹ مل گیا۔□

Mohammed Imteyaz Alam
241,Periyar Hostel,JNU New Delhi-110067

کامکس اسٹوری

بھولے بھالو کی حماقتیں

...اور لکڑ بگھا ہنسنے لگا!

دو گھنٹے بعد
واہ! آخر ڈینٹنگ تو ٹھیک ہوگئی اب مجھے پینٹنگ کا کام شروع کرنا چاہیے!
میرا خیال ہے لال رنگ اچھا رہے گا! لال رنگ اوور ٹائم پارکنگ کے ٹکٹ سے بھی بچ کرے گا
اوہ، ہیری لکڑ بگھا پھر آ گیا! دیکھتا ہوں اب کیسے ہنستا ہے نئی جیسی لگنے والی میری اس شان دار کار پر!
رنگ ابھی سوکھا نہیں!
خوب! پینٹ تو تم نے بہت اچھا کیا ہے بھولے!
تو اب کیا خیال ہے جناب کا اس کار کے بارے میں؟
مگر اس کے رنگ کا ڈیزائن کچھ عجیب سا ہے۔ کیا خیال ہے؟
لعنت ہے! یہ چڑیاں اودھم مچا کر رنگ بگاڑ رہی ہیں
ہا! ہا! ہا! تم نے تو غضب کر دیا بھولے!
لعنتی بے وقوف شیطان چڑیو، دفعہ ہو جاؤ یہاں سے!

لواب میں نے مٹا دیے وہ سارے نشان! اب دیکھتے ہیں ہیری کیسے ہنستا ہے!
ارے ارے، یہ چڑیا کس چیز میں نہانے چلی آئی...
رنگ مٹانے والا تیل
اور یہ پر سکھانے کے لیے اس نے کیا جگہ چنی ہے!!
واہ! دھبوں والی پولکا کار! کیا کمال کا آئیڈیا ہے بھولے! ہا، ہا، ہا!
وہ! یہ شیطان چڑیا پھر چلی آئی
لو، اب یہ رنگ مٹانے والا تیل بہہ کر نیچے آرہا ہے
تم بلاوجہ پریشان ہو رہے ہو بھولے! پورے جنگل ٹاؤن میں لال پٹیوں والی یہ اکیلی کار ہوگی!
ہا! ہا! ہاہا!
میں اس کم بخت چڑیا کا ہی پاک کیے دیتا ہوں!
لگتا ہے چڑیا نے کار کے اسٹارٹ بٹن پر ٹھونگ ماردی تھی! کیا غضب کا جھٹکا لے کر دوڑی ہے کار
بچاؤ بچاؤ
زوں زوں

Buster Bear سے ماخوذ/ترجمہ: شبنم پروین

نانی کے صندوق سے

□ حجاب امتیاز علی

میری سال گرہ

ویسے تو ہر سال میری سال گرہ کی تاریخ سردیوں میں آیا کرتی تھی پر اس سال میں نے تہیہ کرلیا تھا کہ اپنی سال گرہ گرمی میں مناؤں گی۔ اس لیے نہیں کہ گرمیوں میں کوئل کوکتی ہے یا باغوں میں موتیا کے پھول کھلتے ہیں، یا پکے پکے رسیلے آم کھانے کو ملتے ہیں۔ جی نہیں۔ وجہ صرف یہ تھی کہ گرمیوں میں سال گرہ منانے میں مجھے ایک بہت بڑا فائدہ نظر آتا تھا وہ یہ کہ اس موسم میں ہم سب اکٹھے ہوتے تھے، ریحانی بھیا اپنے کالج سے، اور جسوتی چچا کے ہاں سے اور میں اپنے سکول کے بورڈنگ ہاؤس سے دادی زبیدہ کے پاس شہر کے پاس کے ساحلوں پر تعطیلات منانے آجاتے تھے۔ اندھا کیا چاہے؟ دو انکھیاں۔ میں نے اس یکجائی کو غنیمت سمجھا اور دل میں ٹھان لی کہ سال گرہ فوراً ہی منا ڈالنی چاہیے۔ ڈر تھا تو بھیا ریحانی کا۔ کیوں کہ وہ میرے ہمیشہ کے دشمن تھے اور میرے منصوبوں کی عمارت کو دھڑام سے زمین پر گرانے میں انہیں بڑا مزہ آتا تھا، ادھر جسوتی سے بھی اندیشہ تھا کہ کہیں وہ سچی بات دادی زبیدہ سے نہ جا کر لگادے۔ پھر بھی میں تھی بڑی ڈھیٹ اور ارادے کی پکی۔

دوسرے دن صبح صبح ناشتے کی میز پر حلوہ کھاتے کھاتے میں نے نہایت دلیری سے سوال کیا ”تو دادی جان پیاری آپ مجھے کیا تحفہ عنایت فرمائیں گیں؟ وہ...وہ میری سال گرہ سر پر آگئی ہے۔“ جملہ ختم کرتے ہی میں ڈر کے مارے کھانسنے اور بھیا ریحانی کی طرف کن انکھیوں سے دیکھنے لگی۔ دادی زبیدہ نے میری بات سرے سے سنی ہی نہیں، جانے کس نے انہیں یہ بری عادت سکھادی تھی کہ وہ صبح ناشتے کے دوران میں اخبار پڑھنے بیٹھ جاتی تھیں اور ایک دفعہ تو اسی بری عادت کی بدولت اخبار پڑھتے بے خیالی میں گندہ انڈا بھی مزے سے کھا چکی تھیں۔ بعد میں انہیں ابکائیاں بھی آئی تھیں۔

چنانچہ اس وقت بھی وہ اخبار میں قتل وخون، ڈاکہ چوری اور زلزلے کی وحشت ناک خبریں پڑھ رہی تھیں اور مارے خوف کے لرز رہی تھیں مری بات ان کے کانوں تک نہ پہنچ سکی تھی۔

بھیا ریحانی جو آم کے مربے کا مرتبان بڑے زور سے اپنی طرف گھسیٹ رہے تھے۔ میری بات سن کر رک گئے اور میری طرف دیکھ کر پوچھنے لگے ”ارے کیا کہا روحی تم نے؟ سال گرہ؟ کس کی سال گرہ اور کیسی سال گرہ؟“

بھیا ریحانی کو میری قلعی کھولنے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ اس لیے میرے ہوش اڑ گئے کہ کہیں پکڑی نہ جاؤں۔ میں نے دل میں سوچا کہ پہلے دادی زبیدہ کی خوشنودی حاصل کرلینی چاہیے۔ پھر اپنی سال گرہ کا اعلان کرنا چاہیے۔ میں دادی جان کی طبیعت سے خوب واقف تھی کہ انھیں کن باتوں سے خوش کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے میں نے نہایت

ادب سے کہا ”دادی جان پیاری، وہ آپ کی زکام کی گولیاں، اوپر کی منزل میں رہ گئی ہیں، لے آؤں؟ نوش فرمایئے گا؟“

جسوتی کیلا کھاتے کھاتے بولی ”وہ تو دادی جان بہت سویرے کھالیتی ہیں۔“

میں سوچ سوچ کر بولی ”تو پھر آپ کا مفلر لے آؤں دادی جان پنکھے کی ہوا سے کہیں آپ کو چھینک نہ آجائے۔“

بھیا ریحانی آملیٹ کا ایک بڑا سا ٹکڑا کانٹے کے ذریعے مونہہ میں ٹھونستے ہوئے بولے ”اس گرمی میں پنکھے کی ہوا سے دادی جان کو چھینک آئے گی، عقل ماری گئی ہے تمھاری؟“

جسوتی ہنس کر بولی ”آج روحی کو دادی جان کی صحت کی فکر بہت ستا رہی ہے، بات کیا ہے؟ بھٹیارا بنے نمازی تو ضرور ہے دغا بازی۔ ہی ہی ہی ہی۔“ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

میں ڈر کر دادی زبیدہ کو دیکھنے لگی مگر شکر ہے وہ اخبار کی وحشت ناک خبروں میں غرق تھیں۔

بھیا ریحانی بولے ”میں خوب جانتا ہوں جو روحی کا مطلب ہے ہاں...!“ انھوں نے ’ہاں‘ کہہ کر زور سے نمک دانی میز پر ماری تو میز ہل گئی۔

میز کے ہلتے ہی دادی زبیدہ اخبار پھینک کر مارے خوف کے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ”بھاگو بھاگو! ارے باہر بھاگو، زلزلہ آگیا۔ ابھی ابھی میں سیام کے زلزلے کی خبر پڑھ رہی تھی۔“

بھیا ریحانی فوراً کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور تعظیماً جھک کر بولے ”میں معافی چاہتا ہوں دادی جان، وہ زلزلہ نہیں تھا میں نے نمک دانی ذرا میز پر رکھی تھی۔“

دادی زبیدہ ہماری بدتمیزوں کو کبھی بخش نہ سکتی تھیں اس لیے ناراض ہوکر بولیں ”کچھ تو کھانے کی میز کے آداب سیکھو ریحانی، یہ طور طریقے ہوتے ہیں تہذیب یافتہ گھرانوں کے؟ نہ جانے لوگوں کا کیا حشر ہوگا؟“

میں دادی جان پر اپنی تمیز داری کا سکہ بٹھانا چاہتی تھی، اس لیے جھک کر فوراً بکھرے ہوئے اخباروں کے صفحے سمیٹنے لگی۔ پھر دادی زبیدہ کے آگے پیش کرکے بولی ”لیجیے دادی جان اخبار کے صفحے، ریحانی بھیا کے میز پر زور سے نمک دانی رکھنے سے بکھر گئے تھے۔“

”کیا خاک پڑھوا خبار؟ ویسے ہی میں صبح کے وقت وحشت ناک خبریں پڑھ کر دہشت زدہ رہتی ہوں۔ اب میز کے ہلنے سے میرا دل ہل گیا۔ اس کا اثر براہِ راست میرے ہاضمے پر پڑا۔ چنانچہ بھوک بند ہوچکی ہے۔“

میں موقع کی تاک ہی میں تھی بولی ”واقعی ریحانی نے نمک دانی زور سے میز پر رکھی۔ آپ کے لیے بادام کا حلوا پراٹھے پر لگادوں دادی جان پیاری؟ شاید اس سے بھوک کھلے۔“

”نہیں... اب کیا خاک کھلے گی بھوک۔“ وہ ہم سب سے چڑی ہوئی تھیں۔ انھوں نے دوبارہ اخبار اٹھالیا تھا۔

”کہیے تو اسٹرابری جام اسکٹ پر لگادوں آپ کے لیے؟“ میں نے دوبارہ خوشامدانہ لہجے میں پوچھا۔

”تم دراصل چونا لگانا چاہتی ہو ہم سب کو۔ جام اسکٹ پر نہیں۔ میں خوب جانتا ہوں تم کو ہاں...“ ریحانی نے قہر بھری نگاہوں سے مجھے

دیکھتے ہوئے کہا لیکن اس دفعہ انھوں نے 'ہاں' کر کے ہاتھ میز کی بجائے اپنے زانوں پر مارلیا۔

''روحی بیٹی'' دادی جان نے اخبار کو پیچھے سے کہا ''چاہو تو میرے لیے ایک سیب کاٹ دو شاید اس سے میری بھوک کھلے۔''

میں خوش ہوگئی ''جی بہت اچھا'' میں نے جلدی جلدی سیب کاٹتے ہوئے کہا ''یہ لیجیے چھل گیا سیب۔ یہ رہا اس کا ٹکڑا۔ آپ کو زحمت تو ہوگی، مگر ذرا منہ کھولیے تو ایک ننھا سا ٹکڑا اندر ڈال دوں... ہاں تو... دادی جان میں پوچھ رہی تھی آپ مجھے کیا تحفہ دیں گی؟ وہ مری سال گرہ سر پر آگئی ہے۔''

دادی جان پھر اخبار میں غرق، شاید کسی کے قتل کی خبر پڑھ رہی تھیں اس لیے انھوں نے سنا نہیں مگر بھیا ریحانی نے ایک زہریلی نظر مجھ پر ڈالی اور پوچھا ''کس کی سال گرہ؟ اور کیسی سال گرہ روحی؟''

میں نے بات بنائی۔ ''تم بھی ایک افیونی ہو ریحانی بھیا، پرسوں میری سال گرہ ہے، بھول گئے کیا؟''

''جھوٹ اور سفید جھوٹ۔'' ریحانی غصے سے بولے ''تمھاری سال گرہ تو سردیوں میں آتی ہے۔''

اس پر جسوتی زور سے کہنے لگی ''اور کیا... روحی کو تو آج تک گھر پر سال گرہ منانی کبھی نصیب نہیں ہوتی یاد نہیں، ہم مبارک باد کا تار اس کے بورڈنگ ہاؤس کے پتے پر بھیجا کرتے تھے؟'' میں ان لوگوں کی مخالفت پر دل ہی دل میں لرز رہی تھی مگر ہمت ہارنے والی میں بھی نہیں تھی، اپنی بات پر اڑی رہی اور گلا صاف کر کے نہایت متحیر انداز سے کہا ''تم لوگوں کے حافظے کم زور ہیں، وہ سردیوں کی نہیں گرمیوں کی بات ہے۔''

ریحانی کا غصہ بڑھتا جاتا تھا ''برساتوں کی؟ یا جاڑوں کی۔ بات تمھاری سال گرہ کی ہے، میں تمھارے سر کی قسم کھاتا ہوں روحی تمھاری سال گرہ سردیوں میں آتی ہے، اور بیچ سردیوں میں آتی ہے۔''

''خدا کے لیے میرے سر کی قسم تو نہ کھاؤ ریحانی'' میں نے ڈر کر کہا ''مجھے وہم آتا ہے'' میں رونے کے قریب ہوگئی۔

اس پر بھیا ریحانی جوش میں آگئے ''کیوں نہ کھاؤں تمھارے سر کی قسم؟ کھاؤں گا اور ضرور کھاؤں گا۔ ہاں...'' انھوں نے حسب عادت زور سے 'ہاں' کہہ کر میز پر ہاتھ مارا تو اب کے دودھ دان لڑھک گیا اور بالائی کی ایک دھاری میز کے نیچے ٹپ ٹپ گرنے لگی۔

اب دادی زبیدہ اخبار تہہ کر کے ہماری طرف متوجہ ہوگئیں۔ ''ستم ستم! یہ کیا دھینگا مشتی ہے؟ کچھ تو تہذیب سیکھو۔ یہ عادتیں ہوتی ہیں اعلیٰ خاندانوں کے بچوں کی...! ارے یہ آملیٹ کا ٹکڑا میز بے میں کیسے جا گرا؟ یہ دودھ دان کیسے لڑھک گیا؟ یہ بالائی فرش پر کیوں برسنے لگی؟ یہ قیامت کیسے آگئی آخر؟''

بھیا ریحانی نے فریاد کی ''دادی جان، قیامت کیسے نہ آئے۔ روحی اپنی سال گرہ منانا چاہتی ہے۔''

''تو اسے منانے دو، تمھیں کیا اعتراض ہے۔'' جسوتی بولی ''ریحان کو اعتراض اس بات پر ہے کہ یہ دوبارہ اپنی سال گرہ منانا چاہتی ہے۔''

میں نے کہا ''دادی جان پیاری، آپ بتایئے میری سال گرہ سردیوں میں آتی ہے یا گرمیوں میں؟ گرمیوں میں نا...؟''

اتفاقاً بلکہ میری خوش قسمتی سے اس سال دادی زبیدہ بھولنے کے مرض میں بڑی شدت سے مبتلا تھیں، کئی حکیموں اور ڈاکٹروں نے علاج کیا۔ گولیاں دیں، معجون آزمائے، شربت پلائے، آملے کا مربہ عرق گاؤزباں میں گھول کر چٹایا۔ بادام گھس کر کھلائے مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ اب تو حالت یہ تھی اِدھر بات سنی اور اُدھر بھول گئیں۔ اس پر ایسی ہٹ دھرمی۔ کہ جو خود کہیں گی وہی درست، دوسرا

خواہ کتنا ہی سچ بولے، مگر وہ جھوٹا۔ چنانچہ فرمانے لگیں ''ہاں، ہاں روحی کی سال گرہ ہمیشہ گرمیوں میں آتی ہے۔''

بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ میں چہک کر بولی ''پرسوں میری سال گرہ ہے۔ آپ کیا تحفہ عنایت فرمائیں گی، دادی جان پیاری؟''

ایکا ایکی یوں تختہ الٹتا دیکھ کر بھیا ریحانی اور جسوتی جل کر راکھ ہوگئے۔ ریحانی کہنے لگے ''پھر تو میں بھی دوبارہ اپنی سال گرہ مناؤں گا۔ ہاں...'' کہہ کر انھوں نے حسب عادت میز پر زور سے ہاتھ مارا تو اس دفعہ انڈے کا خول اڑ کر گل دان کے ایک پھول میں جا اٹکا۔

''یہ حرکت کیوں کی تم نے۔'' دادی زبیدہ نے ناراض ہو کر کہا۔ ''انڈے کا خول گل دان کے پھولوں میں۔ ایسی حالت میں تم سال گرہ دوبارہ منانا چاہتے ہو۔''

میں ہنس پڑی بولی ''دادی جان پیاری بھلا سال گرہ بھی کوئی ایسی چیز ہے کہ انسان جب جی چاہے منانے لگے؟ پیدائشی تاریخ ہوتی ہے اور پیدا ہونا اپنی اختیاری بات نہیں۔ آپ کے لیے انناس کا مربہ طشتری میں نکال دوں؟''

''نکال دو'' انھوں نے بے پروائی سے کہا۔

''یہ لیجیے۔'' میں پیش کرتے ہوئے پھر بولی ''ہاں فرمایئے آپ مجھے کیا تحفہ دیں گی؟''

وہ اتفاقاً اس صبح مجھ سے خوش تھیں کہنے لگیں ''اتفاق کی بات ہے روحی، تمھارے لیے میرے پاس ایک نادر تحفہ کہیں سے آگیا ہے۔ وہی دے دوں گی اسے دیکھ کر تم باغ باغ ہو جاؤ گی۔''

مارے خوشی سے میرا دل بلیوں اچھلنے لگا، بے تاب ہو کر بولی ''کیا چیز ہے دادی جان؟''

''ابھی نہیں بتاؤں گی۔'' انھوں نے کانٹے کی نوک تلی ہوئی مچھلی کی دم پر رکھ کر فرمایا۔

ریحانی بے اختیار ہو کر بولے ''کم از کم اتنا ہی بتا دیجیے کہ اس کی لمبائی اور چوڑائی کتنی ہے؟''

''ہرگز نہیں...'' انھوں نے مچھلی کے قتلے پر لیموں نچوڑتے ہوئے کہا۔

جسوتی بولی ''وہ چیز کن حرفوں سے شروع ہوتی ہے دادی ع سے یا غ سے؟''

''نہ عین سے نہ غین سے۔ نہ شین سے نہ قاف سے۔'' دادی جان کو غصہ آنے لگا تھا۔

ریحانی اپنا کان قریب لا کر بولے ''میرے کان میں کہہ دیجیے۔ میں ان لڑکیوں سے نہیں کہوں گا دادی اماں۔''

دادی زبیدہ بیچ و تاب کھا کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ''سال گرہ کے دن تک اس کے متعلق ایک لفظ نہ پوچھنا، خبردار۔''

''تو ہائے ہائے، یہ دن کیسے کٹیں گے! ہم لوگ تو سوچتے سوچتے بیمار پڑ جائیں گے، اس کا رنگ ہی بتا دیجیے۔'' ریحانی نے کہا۔

''اور اس کی لمبائی چوڑائی۔'' جسوتی نے التجا کی۔

دادی زبیدہ نفرت کے لہجے میں بولیں۔ ''زبان سے بات نکلی نہیں اور تم لوگوں کو اس کی ٹوہ شروع ہوگئی۔ اچھا بابا سنو، اس کا رنگ سفید ہے، اونچائی چھ انچ اور لمبائی پون فٹ ہے۔ ہاتھ لگانے سے کہیں گرم گرم کہیں ٹھنڈی ٹھنڈی محسوس ہوتی ہے، کہیں روئی کے گالے کی طرح نرم ہے، کہیں پتھر کی طرح سخت۔ اب رہا یہ سوال کہ وہ ہے کیا چیز۔ تو کان کھول کر سن لو، یہ بات سال گرہ کی شام تک ہرگز ہرگز نہیں بتائی جائے گی۔ تم لوگوں میں صبر بھی ہونا چاہیے۔'' یہ کہہ کر انھوں نے پھٹ سے باغ کا دروازہ کھولا اور فوارے کے پاس جا کر بیٹھ گئیں۔ لیکن ہمارے دلوں میں اشتیاق کی آگ اور زیادہ بھڑکا گئیں۔

خدا خدا کر کے سال گرہ کی شام آئی۔

دل دھک دھک کر رہے تھے، پائیں باغ میں تختہ گلاب کے قریب چائے کی میزیں لگی ہوئی تھیں۔ فوارے چل رہے تھے۔ نیلے، پیلے، سرخ، سبز پھول بیلوں ٹہنیوں پر لٹک رہے تھے۔ میری اور جسوتی کی ساری سہیلیاں اور ریحانی کے کئی دوست آتے ہوئے تھے۔ تحفہ کی اسراریت کے متعلق ان سب نے سن رکھا تھا کہ اس دفعہ دادی جان مجھے ایک عجوبہ تحفہ دینے والی ہیں۔ میں اپنی سال گرہ کا زرق برق گلابی جوڑا پہنے خوش خوش اپنی سہیلیوں میں ایک خاص ادا سے چل پھر رہی تھی۔ جسوتی بھی چمک دار جوڑے میں کھلکھلا رہی تھی، پر نہ جانے کیا بات تھی بھیا ریحانی کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ دوپہر ہی سے کچھ سہمے سہمے سے محسوس ہو رہے تھے۔

چائے کا ہنگامہ شروع ہوگیا بچوں نے دادی جان کی جان کھانی شروع کردی کہ خدا کے لیے اب وہ عجیب وغریب چیز ہم سب کو دکھا دیجیے۔ یہ سن کر دادی جان مسکرا کر اٹھیں اور سارے مہمان بچوں کے سامنے بڑے فخر سے اپنی خادمہ سے کہنے لگیں ''صنوبر! اٹھالانا وہ تحفہ لیکن دیکھ بڑی احتیاط سے۔'' یہ سننا تھا کہ صنوبر بالا خانے کی لمبی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ ہم سب زینے کے نیچے کھڑے بے تابی سے منتظر تھے۔ یکا یک ہمارے دیکھتے دیکھتے بالا خانے کی پہلی سیڑھی پر صنوبر سر پر ایک بہت بڑا سا ٹوکرا رکھے نمودار ہوئی۔

ہم سب تالیاں بجانے لگے، اور وہ زینے زینے آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگی۔

''وہ رہا تحفہ''

''وہ آیا تحفہ۔''

''دادی جان کا نایاب تحفہ۔''

غرض جتنے منہ اتنی باتیں، آخر صنوبر نیچے اتر آئی اور مہمانوں کے درمیان ایک میز پر ٹوکرا رکھ دیا گیا۔ سب بے چین ہوگئے کوئی کھڑا ہوگیا، کوئی جھک گیا۔ کوئی اسے چھو کر دیکھنے کو آگے بڑھا۔ مگر کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس سوراخ دار ٹوکری میں آخری ہے کیا۔

میں مارے خوشی کے بلاوجہ قہقہہ پر قہقہہ لگا رہی تھی۔ جسوتی ناچنے لگی تھی، مگر ریحانی ایک ستون کا سہارا لیے باغ کے زینے کے پاس بت بنے کھڑے تھے۔ ایک دفعہ تو انھوں نے ہم سب کی نظر بچا کر مجمع میں یک لخت بھاگ جانے کی بھی کوشش کی تھی۔ اس پر دادی زبیدہ نے زیر لب ڈانٹا بھی تھا کہ ''یہ کیا حرکت ہے آدمی بنو۔''

آخر اس جادو کی ٹوکری کے کھلنے کا وقت آگیا۔ کچھ نہ پوچھیے ہمارے دل فراکوں کے نیچے کس زور سے دھڑک رہے تھے۔

دادی زبیدہ ٹوکری کے قریب جا کھڑی ہوئیں۔ اسے کھولنے کی نیت سے اس پر ہاتھ رکھ کر فخر سے بولیں ''اب دیکھو میرا تحفہ آؤ بچو اور قریب آجاؤ۔ تم بھی کیا یاد کروگی روحی۔ تحفہ دیکھ کر تم پھولے نہ سماؤ گی۔ اب میں ٹوکری کا ڈھکنا اٹھاتی ہوئی۔ ایک، دو، تین۔ لو اٹھا دیا میں نے ڈھکنا۔ یہ رہا وہ عجیب تحفہ...!''

ڈھکن کھول گیا، ساتھ ہی سب کے مونہہ بھی فرط حیرت سے کھل گئے۔ مہمان بچے قہقہہ مار کر ہنسنے لگے۔ میں زور سے رو پڑی۔ کیونکہ ٹوکری خالی تھی۔

دادی جان کا چہرہ فق ہوگیا۔ گرج کو بولیں۔ ''یہ کس کی شرارت ہے؟ تحفہ گیا کہاں؟''

دادی جان کا فقرہ ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ ایک دم بجلی کی سی تیزی

سے کوئی چیز باغ کی جھاڑی پر سے کود کر مہمانوں کی نظروں کے آگے سے نکل گئی، چلی گئی، غائب ہوگئی۔ دادی زبیدہ خوف زدہ ہوکر بولیں ''ہائیں! یہ کیا چیز تھی۔ اصطبل سے کوئی گھوڑا کھل گیا ہے؟''

جسوتی باغ کی دیوار کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہی تھی چلا کر بولی ''ارے گھوڑا نہیں یہ تو ریحانی بھاگے جارہے ہیں۔''

''ریحانی؟'' دادی زبیدہ نے حیران ہوکر بولا ''اچھا اب میں سمجھی۔ اسی کی شرارت ہے۔ بلاؤ اسے۔'' وہ غصے سے چیخیں۔

ہم سب ریحانی کو پکڑنے کے لیے باغ میں بھاگے جارہے تھے وہ اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر اور تیزی سے نکل جاتے تھے کہ عین اپنا رخ اچانک بدل دینے کے باوجود نہ آتے تھے دوبارہ دوڑ شروع ہوگئی۔

سب سے پہلے میں، میرے پیچھے جسوتی، جسوتی کے پیچھے سارے مہمان لڑکے اور لڑکیاں۔ ان کے پیچھے باغ کے مالی، مالیوں کے پیچھے کتے اور کتوں کے پیچھے دادی زبیدہ ہاتھ میں ایک ڈنڈا لیے بھاگی چلی آرہی تھیں۔ مگر اللہ رے ریحانی کی پھرتی! وہ تیر کی طرح دیوار پھاند کھیتوں میں نکل گئے۔ آخر ہم سب تھک تھکا کر واپس آگئے۔ شام ہونے کے بعد مہمان بھی رخصت ہوگئے۔ جب کہیں جاکر رات کے اندھیرے میں ریحانی باغ کے کنویں کے پاس گرفتار کیے جاسکے۔ وہ بھی بوڑھے باورچی نے انہیں اتفاق سے پکڑ لیا۔ وہ بھی اس طرح کہ باورچی جھک کر پانی کی بالٹی اٹھا رہا تھا کہ اس کی لمبی ٹوپی کا سرا ریحانی کی ناک سے جا سرسرایا۔ اس سے انہیں چھینک آئی۔ چھینک کی آواز سن کر باورچی نے آگے ہاتھ بڑھا کر انہیں گرفتار کرلیا، ہم انہیں پکڑ کر اندر لے آئے۔

وہ چور بلے کی سی شکل بنائے دادی زبیدہ کے حضور میں جا کھڑے ہوئے ''دادی جان پیاری، سارا قصور امیر ا ہی ہے'' وہ رو رو کر اقرار جرم کررہے تھے۔ ''وعدہ کیجئے کہ آپ بخش دیں گی۔ پھر میں پورا قصہ سناؤں گا۔''

''کہو جو کہنا چاہتے ہوں؟ احمق کہیں کے۔'' دادی زبیدہ دانت پیس کر کہنے لگیں۔

''اس طرح آپ دانت بجائیں گی اور اور یوں مجھے ڈرائیں گی تو میں ہرگز ہرگز قصہ نہ سناؤں گا۔'' ریحانی بھیا رو کر کہنے لگے۔

دادی زبیدہ کہنے لگیں ''ایک تو تم نے شرارت کی، دوسرے اب شرطیں لگانے لگے کہ یہ کرا تو میں نہ کہوں گا، وہ کرا تو میں نہ سناؤں گا، بتاؤ کیا کیا تھا تم نے؟''

ریحانی لرزتی ہوئی آواز میں بولے ''ہوا یہ کہ میں رات آپ کی خواب گاہ میں جاکر ٹوکری الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا اچانک اس کا ڈھکنا خود بخود کھل گیا، ایک بجلی سی کوند گئی اور کوئی چیز اس تیزی سے اچھلتی کودتی میری آنکھوں کے سامنے سے نکل بھاگی کہ میں ہکا بکا رہ گیا۔ روحی کے سر کی قسم میں اب تک نہ پہچان سکا کہ اس ٹوکری میں کیا بلا تھی۔''

دادی جان بولیں ''ارے بے وقوف لڑکے! ہائے ہائے۔ کس مصیبت سے میں نے روحی کے لیے انگورا کا ایک ترک بلا منگوایا تھا۔ بڑی مشکل سے اسے ٹوکری میں بند کیا تھا۔ مہمانوں کے آگے جو بے عزتی ہوئی وہ تو ہوئی تھی مگر جو مایوسی روحی کو ہوئی وہ الگ۔''

ریحانی بولے ''مگر دادی جان، روحی نے جھوٹ کہا تھا، اس کی سال گرہ تو سردیوں میں آتی ہے، آپ بھول رہی ہیں۔ اسے جھوٹ کی سزا مل گئی۔''

دادی زبیدہ حیران ہوکر مجھے دیکھنے لگیں ''سچ مچ؟ ایک تو تمھاری یہ حرکت۔ اس پر روحی کا یہ جھوٹ۔ لعنت ہے تم لوگوں کی شرارتوں پر۔''

دادی زبیدہ کے غصے کا پارہ ایک سو بیس درجے کو چھو رہا تھا اور ریحانی کی بجائے اب میں اپنے زرق برق گلابی جوڑے میں مجرموں کی طرح سر جھکائے پشیمان کھڑی تھی۔ □

□ حسرت جے پوری

بولو کتنے تیتر

تیتر کے دو آگے تیتر
تیتر کے دو پیچھے تیتر
آگے تیتر
پیچھے تیتر
بولو کتنے تیتر

چار کچرے کچّے
چاچا
چار کچرے پکّے
پکّے کچرے کچّے
چاچا
کچّے کچرے پکّے

پیٹھ اونچی اونٹ کی
اونچائی سے نہیں ہوتی
ہوتی ہی ہے
ہوتی ہی ہے
پیٹھ اونچی اونٹ کی

تیتر کے دو آگے تیتر
تیتر کے دو پیچھے تیتر
آگے تیتر
پیچھے تیتر
بولو کتنے تیتر

جواب: تین تیتر

قسط وار داستان

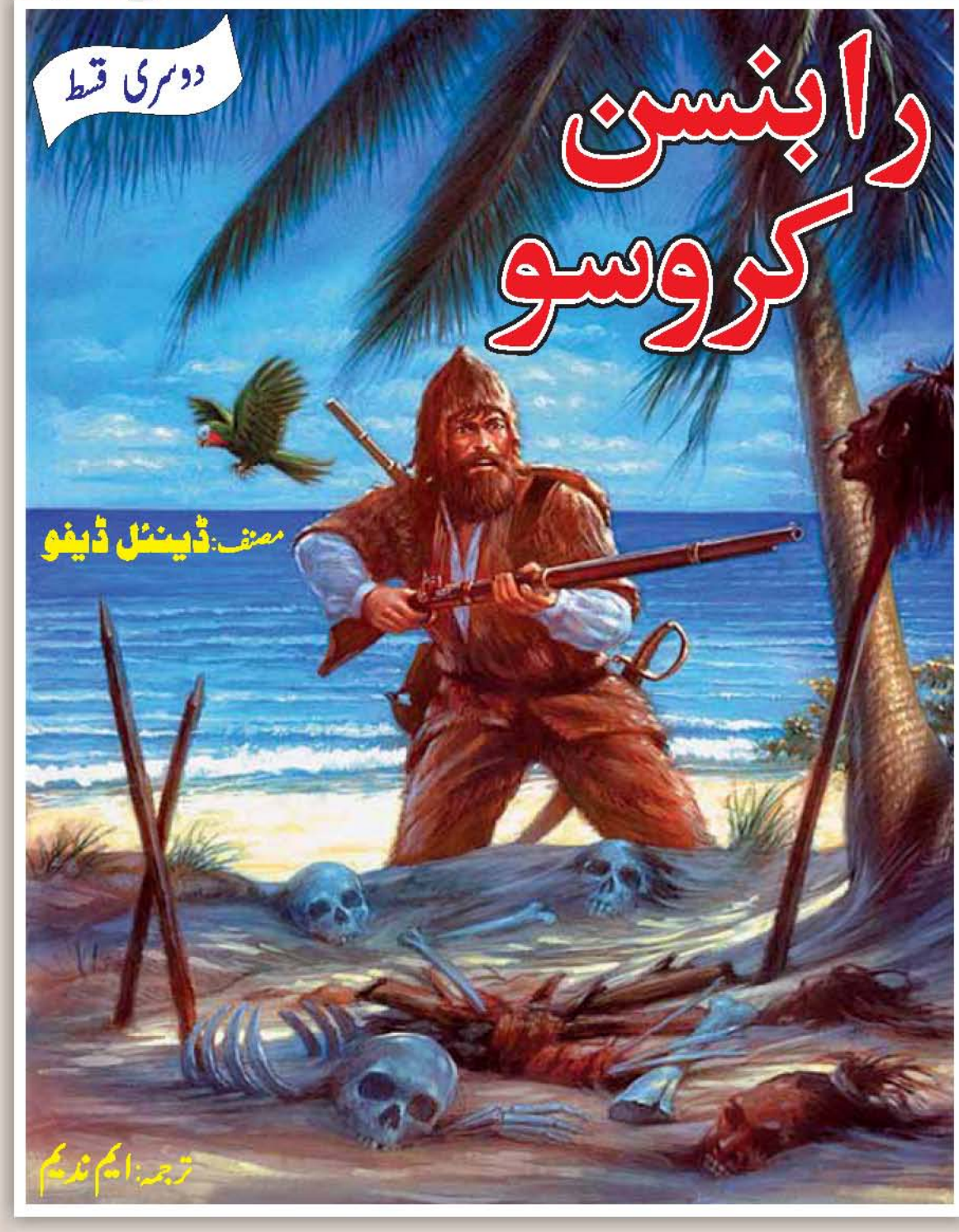

'رابنسن کروسو' انگریزی مصنف ڈینیل ڈیفو Daniel Defoe کا لکھا ہوا مشہور ناول ہے جو سب سے پہلے 25 اپریل 1719 کو چھپا تھا۔ مصنف کا نام اس میں رابنسن کروسو دیا گیا تھا جب کہ اصل میں یہ ڈیفو کے ناول کا خیالی اور مرکزی کردار تھا جو اپنی زندگی کے حیرت انگیز واقعات کو سچا بتا کر اپنی داستان سناتا ہے۔ کتاب کا اصل نام کافی طویل تھا:

The Life and Strange Surprizing Adventures of Robinson Crusoe, Of York Mariner: Who lived Eight and Twenty Years, all alone in an un-inhabited Island on the Coast of America, near the Mouth of the Great River of Oroonoque; Having been cast on Shore by Shipwreck, wherein all the Men perished but himself. With An Account how he was at last as strangely deliver'd by Pyrates

پڑھنے والوں نے اسے سچی کہانی سمجھا لیکن یہ تمام تر خیالی قصوں کا مجموعہ تھا۔ بنیادی کہانی اسکاٹ لینڈ کے باشندے الیگزینڈر سیلکرک Alexander Selkirk کی زندگی سے متاثر ہو کر لکھی گئی تھی جو 1676 میں پیدا ہوا تھا، اپنے وقت کا مشہور ملاح تھا اور سمندر میں لاپتہ ہو گیا تھا۔ اس کی زندگی سے متاثر ہو کر تشکیل دیے گئے کردار رابنسن کروسو کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ 1966 میں بحرالکاہل کے اُس جزیرے 'ماسا تیرا' کا نام رابنسن کروسو رکھ دیا گیا جہاں سیلکرک چار سال تک رہا تھا۔

ڈینیل ڈیفو

کتاب کا مصنف ڈینیل ڈیفو 1960 میں لندن میں پیدا ہوا اور 24 اپریل 1731 کو اس کا انتقال ہو گیا۔ وہ بیک وقت ایک تاجر، مصنف، صحافی اور جاسوس تھا۔ وہ ان مصنفوں میں شامل ہے جنھوں نے انگریزی ادب کے بہت سے جانکار 'رابنسن کروسو' کو بڑا ہی زود نویس مصنف تھا۔ اس نے بہت لکھے جن کی تعداد 500 سے زیادہ ہے اور شادی بیاہ اس کی تحریروں کے چند موضوعات ہیں۔ ناول 'رابنسن کروسو' اس کی سب سے مشہور تصنیف ثابت ہوا جس پر کئی فلمیں بن چکی ہیں، دنیا کی بہت سی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے اور بے شمار کامکس اسٹرپ بنائے جا چکے ہیں۔ قومی اردو کونسل نے پہلی بار 1978 میں اس کی تلخیص اردو میں شائع کی جس کا ترجمہ جناب ایم ندیم نے کیا تھا۔ آیئے اس دل چسپ اور حیرت انگیز واقعات سے بھری ہوئی داستان کا قسط وار مطالعہ کرتے ہیں۔ اعزازی مدیر

اب تک آپ نے پڑھا: رابنسن کروسو اپنی کہانی سناتے ہوئے بتاتا ہے کہ وہ یارک شہر میں 1632 کو ایک دولت مند تاجر کے گھر میں پیدا ہوا۔ سب سے چھوٹا بیٹا ہونے کی وجہ سے اسے باپ کا بڑا لاڈ پیار ملا۔ رابنسن بڑے ہو کر دنیا کی سیر کرنا چاہتا تھا لیکن باپ کو یہ منظور نہ تھا۔ انھوں نے اسے اعلیٰ تعلیم دلائی لیکن دنیا بھر میں گھومنے کی اجازت نہیں دی۔ مگر ایک دن وہ بچپن کے ایک دوست کے ساتھ دنیا کے سفر پر نکل پڑا جو اپنے والد کے ساتھ سمندری جہاز سے لندن جا رہا تھا لیکن یکم ستمبر 1651 کو سفر کے پہلے ہی دن سے منحوس واقعات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جہاز روانہ ہوتے ہی سمندری طوفان آگیا اور رابنسن اپنی زندگی سے مایوس ہو کر پچھتانے لگا کہ والدین کا کہنا نہ مان کر اس نے سخت غلطی کی ہے۔ یہ طوفان گزر گیا لیکن راستے میں پھر ایک طوفان آیا جس میں ان کا جہاز ڈوب گیا۔ وہ اور جہاز کے لوگ جان بچا کر مشکل سے بارمتو شہر کے ساحل پر پہنچے۔ اس کے دوست کے باپ نے کہا کہ یہ سب

رابنسن کی نحوست سے ہورہا ہے جو اپنے بیمار والد کی اجازت لیے بغیر اس سفر پر آیا ہے۔ رابنسن یہ سننے کے بعد واپس گھر چلے جانا چاہتا تھا لیکن اسے باپ کا سامنا کرتے ہوئے شرم آرہی تھی۔ آخر وہ لندن پہنچا جہاں ایک سمندری تاجر نے اسے دوست بنا لیا۔ والد نے کچھ رقم رابنسن کے پاس لندن بھجوادی تھی جس سے اس نے سمندری سفر کا سامان خرید لیا۔ تاجر دوست کے ساتھ وہ گنی کے سفر پر گیا اور خوب منافع کے ساتھ بہت سا سونا جمع کرکے لندن واپس آیا لیکن یہاں اس کا دوست بیمار ہوکر مرگیا۔ اس نے منافع کا بہت سا حصہ دوست کی بیوہ کے پاس رکھا اور گنی کے ایک اور سفر پر روانہ ہوگیا اس بار وہ اور اس کے ساتھی جہازی لٹیروں کے ہتھے چڑھ گئے۔ ایک لٹیرے نے رابنسن کو اپنا غلام بنا لیا مگر کچھ دن بعد رابنس شکار کے بہانے اس لٹیرے کے چنگل سے بچ نکلا۔ سمندر میں ایک جہاز کے نیک دل کپتان نے اس کی مدد کی اور وہ تجارتی سفر پر اسے اپنے ساتھ برازیل لے گیا وہ چار سال برازیل رہا۔ وہاں وہ ایک شوگر فیکٹری بھی کھولنا چاہتا تھا اس کے لیے زیادہ رقم کی ضرورت تھی اس لیے لندن سے اپنے مرحوم تاجر دوست کی بیوہ سے اس نے اپنی جمع شدہ رقم میں سے ایک ہزار پونڈ کے عوض بہت سا سامان منگوا لیا۔اس نے گنّے اور تمباکو کی کھیتی کے گر بھی سیکھ لیے۔مگر اب وہ بے حد دولت مند بننے کے لالچ میں پڑگیا جس کا اسے بے حد نقصان اٹھانا پڑا۔ ایک روز تین تاجروں نے آکر اسے لوگوں کو غلام بنا کر بیچنے کا دھندا کرنے کی صلاح دی اور کہا کہ گنی سے بہت سے غلام مل سکتے ہیں جنہیں بیچ کر خوب دولت کمائی جاسکتی ہے۔ وہ ان کی باتوں میں آگیا اور نیک دل کپتان دوست کو لے کر سمندری سفر پر نکل پڑا۔ اس بار بھی سفر کی تاریخ یکم ستمبر تھی اور سال 1659کا تھاجس سے آٹھ سال پہلے وہ زندگی کے پہلے سمندری سفر پر نکلا تھا۔ تاریخ نے پھر اپنے آپ کو دوہرایا اور کیریبیائی ملکوں کے درمیان طوفان سے ان کے جہاز کو کافی نقصان پہنچا۔ ایک دن ان کا جہاز ریت میں دھنس گیا اور جان بچانے والی کشتی بھی الٹ گئی۔ سمندر کی بپھری ہوئی موجوں نے رابنسن کو ساحل پر لا پٹکا اب اس کے آگے پڑھیے۔

ویران جزیرے میں

میں نے اپنی جان بچ جانے پر خدا کا شکر ادا کیا۔میرا اور کوئی ساتھی زندہ نہیں بچ سکا۔ سب کے سب طوفان کی نذر ہوگئے تھے، صرف میں ہی رہ گیا تھا۔ میرے کپڑے پانی میں بھیگ گئے تھے۔ میرے پاس کھانے پینے کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔ ایک مصیبت سے تو مجھے نجات مل گئی تھی لیکن کھائے پیے بغیر زندہ رہنا ناممکن تھا۔ میں نے سوچا کہ میں بھوک اور پیاس سے تڑپ تڑپ کر مرجاؤں گا یا کوئی جنگلی جانور مجھے کھا جائے گا۔

شام ہوگئی، میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کروں اور کہاں جاؤں۔ میں قریب کے ایک پیڑ پر چڑھ گیا اور رات اسی پر بسر کی۔ دوسرے دن سویرے اترا۔ پیاس کے مارے حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے اور بھوک سے آنتیں اینٹھ رہی تھیں۔ میں میٹھے پانی کی تلاش میں چل پڑا۔ قریب ہی مجھے میٹھے پانی کا چشمہ مل گیا۔ میں نے اچھی طرح پانی پیا۔لیکن کھانے کے لیے میرے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ میری کمر کی پیٹی میں

تھوڑا سا تمباکو، پائپ اور ایک چاقو تھا۔ لاچار ہو کر میں نے تمباکو چبایا کہ کچھ تو پیٹ میں پہنچے۔ دوسری رات بھی میں نے پیڑ پر گزاری۔

اگلے دن موسم اچھا ہو گیا تھا۔ نہ وہ طوفان تھا اور نہ وہ موجوں کا زور اور شور۔ ہمارا جہاز جو ریت میں دھنس گیا تھا وہ موجوں کے زور سے اٹھ کر ایک چٹان کے قریب پہنچ گیا تھا اور سیدھا کھڑا تھا۔ قریب ہی ہماری کشتی اوندھی پڑی تھی اور ریت میں دھنس گئی تھی۔

میں نے سوچا کہ جہاز پر جاؤں شائد وہاں کوئی کھانے پینے کی چیز ہاتھ لگ جائے۔ اس وقت بھاٹے کی وجہ سے سمندر کا پانی اتھلا ہو گیا تھا۔ میں نے کنارے پر کپڑے اتارے اور تیر کر جہاز تک پہنچا۔

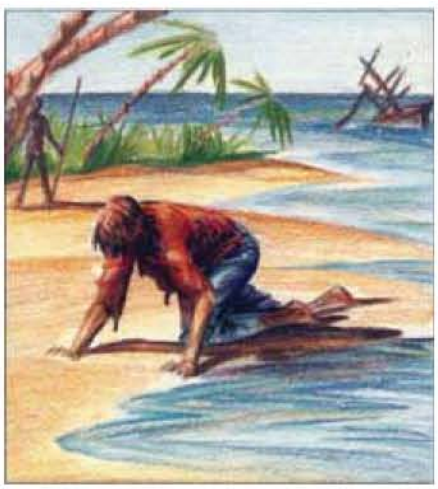

جہاز بہت اونچا تھا اور بغیر کسی سہارے کے اس کے اوپر پہنچنا میرے لیے بہت دشوار تھا۔ میں جہاز کے چاروں طرف تیرتا ہوا گھوم رہا تھا۔ میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے جہاز کے اگلے حصے میں ایک رسّی لٹکتی ہوئی دکھائی دی اور میں اس رسی کو پکڑ کر جہاز پر چڑھ گیا۔ جہاز میں پانی بھر گیا تھا اور سارا سامان پانی اور ریت کی وجہ سے برباد ہو گیا تھا۔ جہاز کا پچھلا حصہ ریت میں دھنس جانے کی وجہ سے جہاز کا اگلا حصہ ذرا اونچا اٹھ گیا تھا اور اس حصے میں رکھا ہوا سامان بچ گیا تھا۔ کھانے پینے کا بہت سارا سامان بڑی اچھی حالت میں تھا۔

میں نے سب سے پہلے تو پیٹ بھر کر روٹی کھائی اور پانی پیا، جب جان میں جان آئی تو دوسری ضروری چیزوں کی تلاش شروع کی۔ وہاں بہت ساری کام کی چیزیں ملیں۔ میں نے ان سب چیزوں کو ایک جگہ لا کر رکھ دیا۔ لیکن چیزوں کو کنارے تک پہنچانے کے لیے تو ناؤ کی ضرورت تھی مگر وہاں ناؤ کہاں؟ اس وقت میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ میں نے جہاز کے ٹوٹے ہوئے مستول کے لٹھوں کو اکٹھا کیا اور برابر کر کے رسی سے باندھا اور انھیں سمندر میں پھینک دیا۔ اس کا ایک سرا رسے سے اور رسے کو جہاز سے باندھ دیا۔ اس کے بعد جہاز پر جو بھی لکڑی کے تختے ملے ان کو لا کر ان لٹھوں پر بچھا کر کیلوں سے جڑ دیا۔ ملاحوں کے تین صندوقوں کے تالے توڑ کر ان کا سامان خالی کیا اور ان کو لا کر ان تختوں پر رکھا۔ ایک صندوق میں کھانے کا سامان، روٹیاں، پنیر، بکری کا خشک گوشت وغیرہ بھر دیا۔ مرغیوں کا دانہ بھی تھیلیوں میں تھا وہ تھیلیاں میں نے خالی کر کے ان میں بھی سامان بھر دیا۔ مرغیاں مر چکی تھیں اور بہت سارا دانہ چوہے کھا گئے تھے۔

اس کام میں مجھے بہت وقت لگا اور سمندر میں جوار آ گیا۔ اس وقت مجھے خیال آیا کہ میں نے کنارے پر جو کپڑے اتارے تھے وہ تو سب بہہ گئے ہوں گے۔ تب میں نے جہاز میں کپڑے تلاش کیے، وہاں تلاش کرنے پر مجھے اپنی ضرورت کے لائق کپڑے مل گئے۔ اس کے علاوہ اوزاروں کا ایک صندوق بھی مل گیا۔ یہ اوزار میرے لیے سونے چاندی سے بھی زیادہ قیمتی تھے۔ جہاز کی کوٹھری میں ہتھیار بھی تھے۔ دو بندوقیں، دو پستول، دو پرانی تلواریں اور چھرّا بارود۔ غرض جو کچھ میرے ہاتھ لگا وہ میں نے اپنی اس بنائی ہوئی ناؤ پر رکھ لیا۔ جب ساری چیزیں اکٹھا ہو گئیں تو خیال آیا کہ ناؤ میں ڈانڈ یعنی پتوار نہیں ہیں۔ اور بغیر ڈانڈ کے میرے لیے ناؤ کو چلانا ممکن نہیں۔ میں پھر جہاز پر چڑھا اور تلاش کرنے پر مجھے وہاں دو ٹوٹے ہوئے ڈانڈ بھی مل گئے۔ اس وقت ہوا بھی موافق چل رہی تھی اور جوار کا پانی کنارے کی طرف جا رہا تھا۔ میری کام چلاؤ کشتی دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہی تھی۔ کئی بار ایسا ہوا کہ میری کشتی الٹتے الٹتے بچی۔ کچھ سامان پانی میں گر کر خراب بھی ہو گیا۔ بڑی مشکل سے کنارہ تک پہنچ سکا۔ میں نے سارا سامان ایک جگہ اتار دیا۔

کیونکہ میں ابھی اس جزیرے کے حالات سے واقف نہ تھا اس

لیے ایسی جگہ کی تلاش میں تھا جہاں بے کھٹکے رہ سکوں اور درندوں اور آدم خوروں سے بچا رہوں۔ ایک میل کے فاصلے پر ایک پہاڑی تھی۔ میں بندوق اور چھرا بارود لے کر پہاڑی پر چڑھ گیا۔ اور چاروں طرف دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے، اس کے چاروں طرف سمندر ہے۔ وہاں نہ آدم ہے نہ آدم زاد۔ صرف چوپائے اور پرندے ہیں۔ میں نے ایک بار بندوق چھوڑی۔ اس کی آواز سن کر چاروں طرف سے پرندے گھبرا کر نکل پڑے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ زمین کی پیدائش سے اب تک اس جزیرے میں یہ بندوق کی پہلی آواز ہے۔ اس جزیرے کے چھ سات میل کے فاصلہ پر دو اور بھی جزیرے تھے لیکن یہ معلوم وہ آباد تھے یا غیر آباد۔ مجھے اس کا اندازہ نہ ہو سکا۔

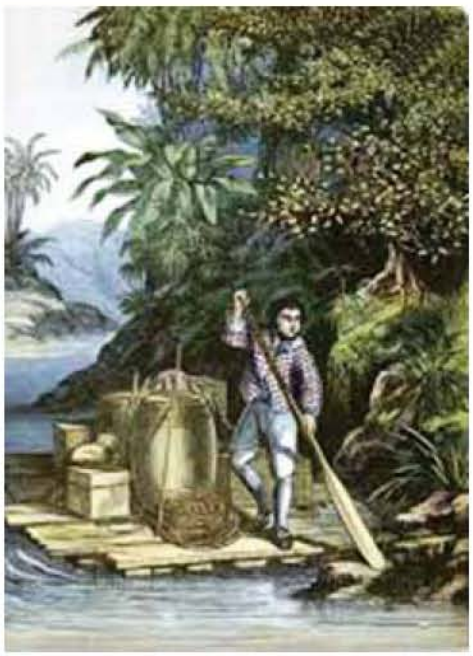

سارا دن اسی طرح محنت کرتے گزر گیا۔ رات ہوئی تو مجھے اپنے سونے کی فکر ہوئی۔ میں نے صندوق اور بھاری چیزوں کو چاروں طرف رکھ کر ایک کوٹھری سی بنائی اور بیچ میں اپنا بستر لگایا۔ درندوں سے میرا ڈرنا فضول تھا کیوں کہ یہاں پر میں نے ایک بھی درندہ نہیں دیکھا تھا۔

دوسرے دن میں نے سوچا اگر دوبارہ طوفان آیا تو جہاز میں جو سامان بچا ہوا ہے وہ برباد ہو جائے گا۔ اس لیے مناسب یہی ہے کہ جہاز سے اور سامان اٹھا لاؤں۔ چنانچہ میں پہلے کی طرح کپڑے اتار کر جہاز پر گیا اور بہت سارا سامان اٹھا لایا۔ جہاز کے لٹھوں اور تختوں کی مدد سے اب میں بیڑہ بنانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس بار سامان میں بڑی ضروری چیزیں ملیں مثلاً بڑھئی کے اوزار، کیلوں سے بھرے تھیلے، پیچ کش، آری اور بسولہ وغیرہ۔ سب سے زیادہ فائدہ مجھے اوزاروں پر سان رکھنے یعنی دھار لگانے والے پتھر کے پہیے سے ہوا۔

اس کے علاوہ چارپائی، چادریں، بادبان وغیرہ بھی اٹھا لایا اور اس میں جہازیوں کے پہننے کے بہت سارے کپڑے بھی تھے وہ بھی میں لے آیا۔

بارود کے پیپے چونکہ بہت بھاری تھے اس لیے میں انھیں اپنی بنائی ہوئی کشتی پر نہیں لا سکتا تھا۔ میں بارود کی چھوٹی چھوٹی تھیلیاں بنا کر اپنے ڈیرے تک لے آیا۔ جب سارا سامان آ گیا تو میں نے وہاں ایک خیمہ بنانے کا ارادہ کیا۔ ایک کھمبا کھڑا کر کے اس پر جہاز کا پال تان دیا اور سارا سامان اس کے نیچے رکھ دیا تا کہ دھوپ اور بارش میں خراب نہ ہو جائے۔ خیمہ کے چاروں طرف پیپے اور صندوق اس طرح سے لگا دیے کہ اس کے اندر کوئی جانور نہ آ سکے۔ خیمہ کے دروازہ پر ایک الٹا صندوق رکھ کر اس کے دروازہ کو تختوں سے بند کر دیا اور خیمہ کے بیچوں بیچ اپنا بستر لگا اور آس پاس دو بندوقیں رکھ کر سو گیا، چونکہ بہت تھکا ہوا تھا اس لیے لیٹنے پر بہت گہری نیند آئی۔

اپنے پاس اتنی بہت ساری اور قسم قسم کی چیزیں دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی لیکن میں نے فیصلہ کیا کہ جب تک یہ جہاز اس حالت میں ہے اس وقت تک جتنی بھی چیزیں اس میں سے نکال سکوں گا، نکال لاؤں گا۔ اس طرح میں بھاٹے کے وقت جہاز پر جاتا اور جو بھی چیز ملتی اسے جوار کے وقت لے آتا۔ تیسری بار میں رسے، رسیاں، پال، سوت اور بارود کا بھیگا ہوا پیپا اور جتنے بادبان تھے وہ سب کاٹ کر لے آیا۔

اس طرح میں بارہ دفعہ جہاز پر گیا اور میں نے ایک ایک چیز لا کر اپنے خیمہ میں اکٹھا کر دی۔ ایک بار میرا بیڑہ پانی میں الٹ گیا اور کئی چیزیں خراب ہو گئیں۔

جہاز کی ایک الماری میں مجھے تین سو پونڈ اور کچھ سونا اور چاندی

بھی ملا۔ اس وقت میں اپنے دل میں بہت ہنسا۔ کیوں کہ وہاں یہ دولت میرے لیے کنکر پتھر کے مانند تھی۔ میں ان سے کوئی چیز اس ویران جزیرے میں نہیں خرید سکتا تھا، میں اس رقم کو کمر سے باندھ کر لے آیا اور سونے چاندی کے ساتھ رقم بھی صندوق میں رکھ دی۔

ایک رات ہوا بہت تیز چلتی رہی۔ صبح میں نے سمندر کی طرف دیکھا تھا جہاز وہاں نہیں تھا۔ ڈوب گیا تھا۔ مجھے افسوس ہوا۔ لیکن میرا افسوس کرنا بے کار تھا کیوں کہ میں جہاز سے ایک ایک چیز اٹھالایا تھا۔ ہاں اگر تھوڑا وقت اور ملتا تو میں جہاز کو بھی ٹکڑے ٹکڑے کر کے اٹھالاتا۔

میرا خیمہ جس جگہ پر تھا وہ جگہ ذرا نیچے تھی۔ میں ایسی جگہ پر رہنا چاہتا تھا جو محفوظ بھی ہو اور سایہ دار بھی اور میٹھے پانی کے قریب بھی۔ اس کے ساتھ ہی سمندر کے پاس بھی ہوتا کہ اگر کبھی کوئی جہاز ادھر آئے تو میں دیکھ لوں اور اس ویران جزیرے سے نکل سکوں۔

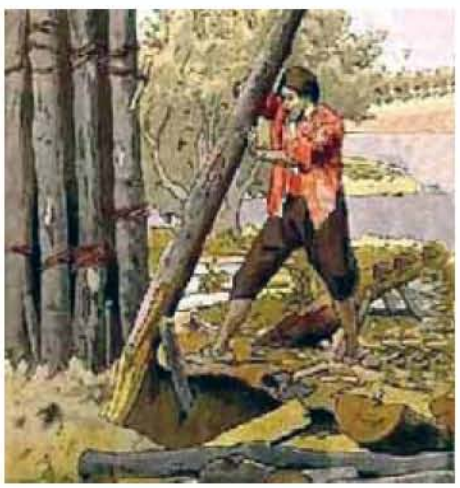

تلاش کرنے پر مجھے ایک جگہ مل گئی۔ پہاڑی کے پاس ہی ایک چھوٹا سا میدان تھا، اس کے ایک طرف تو پہاڑی تھی اس لیے ادھر سے کسی جنگلی جانور کے آنے کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ دوسرے یہ میدان پہاڑ کے اندر کی طرف پچھم کی سمت واقع تھا اس لیے یہاں تمام دن سایہ رہتا تھا، صرف تیسرے پہر کو ذرا سی دیر کے لیے دھوپ آتی تھی۔ قریب ہی پانی کا چشمہ بھی تھا اور یہ جگہ سمندر کے قریب تھی۔ میں نے یہیں پر اپنا خیمہ گاڑنے کا فیصلہ کیا۔

یہ جگہ تقریباً دو سو گز لمبی اور اتنی ہی چوڑی تھی۔ میں نے بیس ہاتھ لمبا اور دس ہاتھ چوڑا ایک گھیرا بنایا اور اس گھیرے کے نشان پر دو قطاروں میں چھ چھ انچ کی دوری پر لکڑی کی کھونٹیاں گاڑ کر ان میں جہاز کا رسا لپیٹ دیا۔ اس کے چاروں طرف ڈیڑھ ڈیڑھ ہاتھ اونچی کھونٹیاں اور گاڑ دیں۔ اس کے بیچ میں میرا خیمہ تھا۔ یہ گھر بہت مضبوط تھا اس میں کوئی چوپایہ یا آدمی نہیں گھس سکتا تھا۔ کھونٹیاں بنانے اور گاڑنے میں مجھے بہت محنت کرنی پڑی اور میرا بہت وقت لگا۔

میں نے اپنے گھر کا باہر سے کوئی دروازہ نہیں رکھا تھا۔ بلکہ ایک سیڑھی لگا کر اندر کود جاتا تھا اور اندر پہنچ کر سیڑھی کو اٹھالیتا تھا۔ میرے مکان کے چاروں طرف گھیرا ہی گھیرا تھا۔ کوئی دوسرا اس کے اندر نہیں آسکتا تھا۔ اب میں رات کو بے فکر ہو کر سوتا تھا۔

چونکہ یہاں برسات کے موسم میں بارش بہت تیز ہوئی اس لیے میں نے سامان کی حفاظت کے لیے ایک دوہرہ خیمہ تیار کیا۔ یعنی ایک خیمہ اوپر اور دوسرا اس کے نیچے۔ خیمہ کے اندر میں نے سارا سامان بہت سلیقہ کے ساتھ اس طرح سے رکھ دیا تھا کہ ایک ایک چیز الگ الگ رہے اور خراب بھی نہ ہونے پائے۔ میں نے مٹی لاکر اور پتھر اکٹھا کر کے خیمے کے چاروں طرف ہاتھ بھر اونچی اونچی دیوار بھی بنا ڈالی تھی۔

میرے پاس چونکہ قلم اور دوات نہ تھی اس لیے میں کچھ لکھ نہ سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے یادداشت کے لیے یہ کیا کہ ایک لمبا سا لکڑی کا چوکھٹا سمندر کے کنارے گاڑ دیا اور اس پر چھری سے یہ الفاظ کھود دیے۔

میں 30 ستمبر 1959 کو اس ٹاپو میں آیا

میں ہر روز اس چوکھٹے پر چھری سے ایک نشان بنا دیا کرتا تھا اور ہر ہفتہ اس سے بڑا اور ہر ماہ اس سے بھی بڑا۔ اس طرح میں دنوں، ہفتوں اور مہینوں کا حساب رکھتا تھا۔ یہ میرا کلینڈر تھا۔ ایک دن میں نے جو ایک صندوق کھولا جو جہاز پر سے لایا تھا تو اس صندوق میں سے کاغذ، قلم، دوات علاوہ قطب نما، دوربین، نقشے اور انجیل کے دو نسخے بھی ملے۔ یہ جہاز کے کپتان کا صندوق تھا۔

جب کاغذ اور قلم مل گئے تو میں نے روزانہ کے حالات لکھنا

شروع کر دیے۔ میں یہ روزنامچہ اس وقت تک لکھتا رہا جب تک کہ قلم، سیاہی اور کاغذوں نے میرا ساتھ دیا۔ لیکن جب سیاہی ختم ہوگئی تو میں نے لکھنا بند کر دیا۔

مجھے زندگی گزارنے کے لیے کھانے پینے کے علاوہ اور بھی بہت ساری چیزوں کی ضرورت تھی۔ مثلاً سیاہی، مٹی کھودنے کے لیے کدال پھاوڑہ، بیلچہ اور سوئی ڈورا وغیرہ۔ لیکن ان چیزوں کے نہ ہونے سے مجھے بہت زیادہ تکلیف نہیں ہوئی کیونکہ میں ان کے بغیر بھی کسی نہ کسی طرح سے اپنا کام نکال ہی لیتا تھا۔

مجھے ایک جھونپڑے کی ضرورت تھی۔ لیکن چونکہ وہاں ضرورت کے سارے اوزار اور سامان نہ تھے اس لیے مجھے صرف ایک جھونپڑا بنانے میں ایک سال لگا۔ میں روز جنگل جاتا، پیڑ کاٹتا، موٹی موٹی شاخیں چھیلتا اور بھاری لکڑی کو گھسیٹ کر گھر تک لاتا۔ لیکن جب جھونپڑا بن کر تیار ہوگیا تو مجھے بہت خوشی ہوئی اور مجھے ایک قسم کا سکون ہوگیا۔ اب مجھے ٹاپو میں گھومنے پھرنے اور پیٹ بھرنے کے علاوہ کوئی دوسرا کام نہیں تھا۔

ہاں میں یہ بتانا تو بھول ہی گیا کہ میں دو بلیوں کو بھی جہاز سے لے آیا تھا اور ایک کتا بھی جہاز پر موجود تھا جو پانی میں کود کر تیرتا ہوا کنارے تک آ گیا تھا۔ اس کتے نے بہت دنوں تک میری خدمت کی۔ وہ میرا وفادار ساتھی تھا۔ میرا اشارہ فوراً سمجھ جاتا تھا۔ بس بول نہیں سکتا تھا۔

میں روزانہ بندوق اور چھرا، بارود لے کر جنگل میں چلا جاتا تھا اور کبھی کبھی کوئی پرندہ یا بکری مار لاتا تھا اور اس کا گوشت بہت کفایت کے ساتھ خرچ کیا کرتا تھا۔

میں کبھی کبھی تنہائی سے گھبرا کر رونے لگتا تھا۔ مجھے بار بار یہ خیال آتا کہ چونکہ میں نے ماں باپ کی نافرمانی کی ہے اور ان کا دل دکھایا ہے اس لیے خدا نے مجھے یہ سزا دی ہے اور مجھے اس ویران جزیرہ میں قید کر دیا ہے۔ میں سوچا کرتا تھا کہ کیا میں کبھی یہاں سے رہائی پا کر دوبارہ انسانوں کی صورت دیکھ سکوں گا یا یوں ہی مر جاؤں گا!

میں نے مکان بنایا اور...

میں نے اپنا سارا سامان بہت حفاظت کے ساتھ رکھنے کے لیے یہ کیا کہ جھونپڑے کے برابر کی پہاڑی کی دیوار کو کاٹ کر ایک غار نما چھوٹی سی کوٹھری بنائی۔ لیکن چونکہ سامان بہت زیادہ تھا اس لیے میں دھیرے دھیرے کھود کر اس کو چوڑا کرتا رہا۔ یہاں تک کہ پہاڑی کی دوسری طرف ایک راستہ سا نکل آیا۔ اس طرح یہ میرا دو دروازوں والا مکان تھا۔ میں نے اپنا سارا سامان بڑے سلیقے سے رکھ دیا تھا۔

میرے پاس کھانے اور پڑھنے کی میز اور کرسی نہ تھی میں نے صرف کلہاڑی اور بسولہ کی مدد سے میز اور کرسی تیار کی۔ حالانکہ اس سے پہلے میں نے کبھی بڑھئی کا کوئی کام نہیں کیا تھا۔ ہاں اس کام میں مجھے محنت بہت کرنی پڑی اور وقت بھی بہت لگا۔ لیکن میرے پاس وقت کی کمی نہ تھی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اس ویران جزیرے میں ہی مجھے زندگی گزارنا ہے اور وقت گزارنے کا آسان اور سستا نسخہ یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو ہر وقت کام میں مشغول رکھے۔

میں روزانہ جنگل جاتا، کسی اچھے درخت کو چنتا، اور اس کے تنے کو کلہاڑی سے کاٹتا۔ پھر اس کو چھیل چھال کر بسولہ کی مدد سے سڈول اور ہموار کر لیتا۔ اس طرح ایک درخت کے تنے سے ایک ہاتھ لمبے کئی

تختے تیار کر کے غار کے اندر الماری کی طرح جڑ دیے اور وہاں اپنے سارے اوزار الگ الگ قرینہ سے رکھ دیے تھے۔ جب ضرورت پڑتی تو انھیں آسانی کے ساتھ اٹھا لیتا تھا۔ اس کے علاوہ کئی جگہوں پر کیلیں گاڑ کر ان پر پستول اور چھوٹی چھوٹی چیزیں لٹکا دیں تھیں۔ اس طرح اپنی ساری چیزیں بہت سلیقہ کے ساتھ رکھی ہوئی دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ میں شروع میں اکثر پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ہو کر گھنٹوں سمندر کی طرف دیکھا کرتا تھا کہ شاید کوئی جہاز ادھر آ نکلے۔ کئی بار مجھے سمندر کی سطح پر جہاز کی بادبان سے دکھائی دیئے لیکن بعد میں یہ راز کھلا کہ وہ جہاز کے بادبان نہ تھے بلکہ صرف میرا وہم تھا۔ جہاز کا تصور میرے دماغ میں ایسا سما گیا تھا کہ سمندر کی لہروں پر سورج کی چمک میں مجھے جہاز کے بادبان دکھائی پڑتے تھے۔

میں نے جھونپڑے سے لے کر غار کے دروازے تک سونٹے گاڑ کر ان کو درخت کے پتوں سے ڈھک دیا تھا۔ اس طرح برسات میں غار سے جھونپڑے تک آسانی سے آجا سکتا تھا۔

ایک دن میں غار کے اندر کام کر رہا تھا کہ ایک طرف کی دیوار میں سے مٹی گرنے لگی۔ میں گھبرا کر باہر نکل گیا۔ میرے نکلتے ہی غار کی چھت میں سے بہت ساری مٹی آ گری۔ اگر میں غار کے اندر ہوتا تو اس وقت وہ غار میری قبر بن جاتا اور مجھے دفنانے کی ضرورت نہ پڑتی۔ غار کے اندر گری ہوئی مٹی کو پھینکنے کے لیے مجھے بہت محنت کرنی پڑی۔ تب میں نے مٹی کو روکنے کی تدبیر کی اور غار کی چھت میں لکڑی کے تختے لگائے۔ پہلے میں نے لکڑی کی بلیاں کھڑی کیں اور ان کو تختوں سے جڑ دیا۔ اس طرح غار میں چھوٹی چھوٹی کئی کوٹھری سی بن گئیں اور مٹی گرنے کا ڈر بھی نہیں رہا۔

ایک بار میں نے ایک بکری کا شکار کیا۔ دوسری بکری لنگڑی ہو گئی تھی میں اس کو رسی سے باندھ کر گھر لے آیا۔ میں نے اس کی تیمارداری کی یہاں تک کہ وہ بالکل ٹھیک ہو گئی اور مجھ سے مانوس ہو گئی۔ وہ میرے جھونپڑے کے پاس ہی گھاس چرا کرتی تھی۔ یہ دیکھ کر مجھے خیال ہوا کہ میں بہت ساری بکریاں پال لوں تو خوراک کی تلاش سے بچ جاؤں اور اگر میرے بارود اور چھرّے ختم ہو جائیں تو بھی مجھے برابر گوشت ملتا رہے گا اور پھر کوئی پریشانی نہ ہوگی۔

مجھے کھانے پینے کے سامان کو اکٹھا کرنے کا بھی خیال آیا۔ میں نے سوچا کہ بارش، سردی یا بیماری اور آنے والے بڑھاپے کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ میرے پاس کھانے پینے کا سامان ہر وقت رہے۔

جب میرے پاس موم بتیاں ختم ہو گئیں تو میں اندھیرے کی وجہ سے رات کو جلدی سو جایا کرتا تھا۔ لیکن بعد میں میں نے یہ ترکیب نکالی کہ مٹی کا ایک چراغ بنا کر اس کو دھوپ میں خشک کر لیا اور پھر بکری کی چربی اس چراغ میں جلایا کرتا۔

میرے غار کے قریب ہی جو میدان تھا میں نے برسات کے موسم میں کچھ پودوں کے انکھوے دیکھے۔ اس وقت میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کس چیز کے انکھوے ہیں۔ چند دنوں کے بعد جب اس میں کچھ پتے بھی نکلنے لگے تو میں نے پہچانا کہ وہ دھان اور جو کے پودے ہیں مجھے یہ جان کر بہت ہی تعجب ہوا اور میں نے خدا کا بہت شکر ادا کیا کہ اس نے میری پرورش کے لیے یہ پودے اگائے ہیں۔

ایک دن مجھے یاد آیا کہ میں جہاز سے جو سامان لایا تھا اس میں مرغیوں کے دانہ رکھنے کی تھیلیاں بھی تھیں۔ میں نے سامان رکھنے کے لیے ان تھیلیوں کو گھر کے سامنے جھاڑا تھا، ان تھیلیوں میں بچے کھچے جو اور دھان جو تھے وہ وہاں گر گئے تھے۔ برسات میں زمین نرم اور تر ہو گئی اور یہ دانے اگ آئے۔ بہر حال یہ خدا کی مہربانی ہی تھی کہ یہ دانے اُگ آئے اور چڑیوں سے بچے رہے۔

جون کے مہینے میں یہ دانے پک کر تیار ہوگئے تو میں نے ان کو بہت احتیاط کے ساتھ اکٹھا کیا اور حفاظت کے ساتھ رکھ دیا کہ جب اگلی فصلوں میں بوتے بوتے یہ بہت سارے ہوجائیں گے تب روٹی بنا کر کھاؤں گا۔ میں چار سال تک ان دانوں کو بوتا رہا، تب کہیں جا کر مجھے غلہ کی صورت دکھائی پڑی۔

ایک بار میں اور میرا غار والا مکان تباہ ہوتے ہوتے بچا۔ ہوا یہ کہ میں ایک دن غار والے مکان میں کام کررہا تھا کہ لکڑی کی وہ چھت جو میں نے مٹی روکنے کے لیے لگائی تھی چرچرا کر ٹوٹ گئی۔ میں بدحواس ہوکر تیزی سے باہر بھاگا۔ زلزلہ کے زور سے زمین تین چار بار ہلی۔ دراصل میرے مکان سے ایک کوس کے فاصلے پر سمندر کے کنارے ایک پہاڑ تھا۔ اس کی ایک بڑی سی چٹان خوفناک آواز کے ساتھ گری تھی، پورا جزیرہ کانپ گیا، سمندر کا پانی ابلنے سا لگا۔ اسی وقت طوفانی ہوا چلنے لگی، بادل گھر آئے اور بارش ہونے لگی۔ میں جھونپڑے میں جا بیٹھا، تین دن تک یہی حالت رہی۔

اب مجھے فکر ہوگئی کہ اگر اسی طرح زلزلے آتے رہے تو میرا غار والا مکان اور اس کا سامان تباہ ہوجائے گا اور میں بھی دب کر مرسکتا ہوں۔ پہاڑی پر سے کسی وقت بھی کوئی چٹان میرے جھونپڑے پر گر سکتی ہے۔ اس ڈر سے میں نے یہ فیصلہ کیا کہ میں کسی محفوظ جگہ پر جا کر رہوں گا۔ لیکن بہت تلاش کرنے پر بھی مجھے اس سے اچھی کوئی اور محفوظ جگہ نہیں مل سکی اور میں نے فی الحال یہیں پر رہنے کا فیصلہ کیا۔

میرے پاس تین کلہاڑیاں اور ایک بسولہ تھا۔ وہ سب سخت لکڑیاں چھیلتے چھیلتے کند ہوگئے تھے۔ میرے پاس اوزاروں پر سان رکھنے کا ایک پہیہ تو تھا لیکن ایک ہاتھ سے گھمانے اور ایک ہاتھ سے چلانے سے اوزاروں پر ٹھیک سے سان نہیں رکھی جاسکتی تھی۔ میں نے غور کرکے پیر سے گھمانے کی ترکیب نکالی اور دونوں ہاتھوں کی مدد سے اوزار پکڑ کر سان رکھنے لگا۔ اس طرح میں نے اپنے سارے اوزاروں پر اچھی طرح سے سان رکھی جس سے وہ پھر عمدہ طریقہ پر کام کرنے لگے۔

وہ روٹیاں جو میں جہاز پر سے لایا تھا اب وہ تھوڑی سی رہ گئی تھیں۔ میں نے اپنی خوراک بہت کم کردی تھی۔ بس ایک روٹی روزانہ کھایا کرتا تھا۔ میرا دل اس بات سے رنجیدہ رہتا تھا کہ جب روٹیاں ختم ہوجائیں گی تو میں کیا کھاؤں گا۔

میرے حساب سے وہ مئی کی پہلی تاریخ تھی۔ میں نے سمندر کے کنارے ایک پیپا اور کسی ٹوٹے ہوئے جہاز کے تختے دیکھے۔ قریب ہی تباہ شدہ جہاز کا ایک حصہ پانی میں دکھائی دیا۔ میں سوچنے لگا کہ شاید کوئی کام کی چیز میرے ہاتھ لگ جائے جہاز تک چلا گیا۔ جہاز کا پچھلا حصہ اگلے حصے سے الگ ہوگیا تھا اور اس میں ریت بھر گئی تھی۔ اس لیے اندر جانا مشکل تھا۔ میں نے جہاز کے تختوں کو توڑا تو اندرونی حصہ دکھائی دینے لگا۔ پانی اور ریت کی وجہ سے کھانے پینے کا بہت سارا سامان خراب ہوگیا تھا۔ میں اس میں سے بہت سارا لوہا، لکڑی اور سیسہ وغیرہ نکالنے میں کامیاب ہوگیا۔ یہ سامان اتنا بہت سا تھا کہ اس سے ایک بڑی اور اچھی کشتی تیار ہوسکتی تھی۔ لیکن افسوس یہ تھا کہ میں کشتی بنانا نہیں جانتا تھا۔

میں نے پہلی بار سمندر کے کنارے بہت بڑے کچھوے دیکھے۔ ایک کچھوے کو مار کر اس کے پیٹ سے انڈے نکالے، جب سے میں اس جزیرہ میں آیا تھا میں نے انڈے نہیں کھائے تھے۔ یہ انڈے مجھے بہت ذائقہ دار معلوم ہوئے۔

جون کی 18 تاریخ کو تمام دن بارش ہوتی رہی۔ میں گھر سے نہیں نکلا۔ سردی بڑھ گئی تھی۔ مجھے سردی لگ گئی اور بخار آ گیا۔ میں تمام رات سو بھی نہیں سکا اور سر کے درد میں مبتلا رہا۔ بیماری اور تنہائی سے گھبرا کر خدا سے دعا کرتا رہا۔ اس طرح میں آٹھ دن تک بخار میں پڑا رہا۔ کبھی کبھی بخار ہلکا بھی ہو جاتا تھا۔ میں بہت کمزور ہو گیا تھا۔ کھانے پینے کے لیے بھی کچھ نہ تھا۔ باہر جانے کی ہمت بھی نہیں تھی۔ لیکن بغیر جائے کام بھی کیسے چل سکتا تھا۔ بندوق لے کر نکلا اور میں نے ایک بکری کا بچہ شکار کیا اور جیسے تیسے کر کے اسے گھر تک لایا۔ دوسرے دن پھر بخار نے آدبایا۔ پیاس کی شدت سے میرا گلا خشک ہو رہا تھا۔ لیکن گھر میں پانی کی ایک بوند بھی نہیں تھی اور میرے جسم میں اٹھ کر باہر جانے کی طاقت نہ تھی۔ مجبوراً پیاسا ہی پڑا رہا۔

دوسرے دن بخار کچھ ہلکا پڑ گیا۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ میں نے ایک ٹکڑا گوشت کا کھایا اور رات کو تین کچھوے کے انڈے کھائے۔

مجھے یاد آیا کہ ملک برازیل میں جب کسی کو بخار آتا ہے تو وہاں کے لوگ تمباکو سے اس کا علاج کرتے ہیں۔ صندوق میں تھوڑا سا تمباکو رکھا تھا لیکن میں یہ نہیں جانتا تھا کہ بخار کے لیے تمباکو کو کس طرح استعمال کرتے ہیں۔ میں نے پہلے تو تمباکو کا پتہ چبایا، لیکن اس کے چبانے سے مجھے چکر سا آنے لگا۔ پھر میں نے یہ کیا کہ دو تین پتے شراب میں بھگو دیے اور سوتے وقت اسے پیا۔ تیسری ترکیب یہ کی کہ تمباکو کے پتوں کی دھونی ناک میں لی اور چادر لپیٹ کر لیٹا رہا۔

سوتے وقت جو تمباکو شراب میں بھیگا ہوا پیا اس کا اثر یہ ہوا کہ مجھے بہت گہری نیند آئی اور میں تمام رات اور اگلے دن تک سوتا رہا۔ بلکہ دوسری رات بھی نہ جاگا اور تیسرے روز دن چڑھے اٹھا۔ جاگنے پر میں نے اپنے آپ کو تندرست محسوس کیا۔ اس دن مجھے بھوک بھی خوب لگی۔

اب میرا بخار جاتا رہا اور میں بالکل اچھا ہو گیا۔ لیکن جسمانی کمزوری باقی تھی۔ رفتہ رفتہ میرے جسم میں پہلے جیسی طاقت آ گئی اور میں بالکل اچھا ہو گیا۔ اب میں خدا سے دعا کیا کرتا تھا کہ جس طرح مجھے بیماری سے نجات دلائی ہے اسی طرح اس ویران جزیرے کی قید سے بھی نجات دلائے۔

مجھے اس جزیرے میں رہتے ہوئے اب دس مہینے بیت چکے تھے دوسرا مکان بنانے اور نئی جگہوں کے دیکھنے کے شوق میں میں نے سارا جزیرہ چھان مارا۔ مجھے یقین ہے کہ مجھ سے پہلے کسی دوسرے انسان نے اس جزیرہ پر اب تک قدم نہیں رکھا تھا۔

میں ایک پہاڑی پر گیا، اس پر طرح طرح کے میوہ دار پیڑ تھے۔ اس کے علاوہ ککڑیاں، پھوٹ اور خربوزے وغیرہ زمین پر بچھے پڑے تھے۔ انگور کی شاخوں میں گچھے لٹک رہے تھے۔ انگور پا کر میرا دل بہت خوش ہوا۔ میں نے احتیاط سے کھائے کیونکہ زیادہ کھانا کھانے سے بخار آ جاتا ہے۔ میں نے بہت سارے انگور توڑ کر دھوپ میں سکھائے اور منقیٰ بنا لیے۔ اس کے آگے اور بھی اچھی جگہ تھی، میں نے یہاں سے لیمو توڑے۔ لیمو کا عرق پانی میں ملا کر پینے سے پانی بہت ذائقہ دار لگا۔

دوسری بار میں تھیلی لے کر گیا اور بہت سارے لیمو توڑ لایا۔ انگوروں کے گچھے محفوظ کرنے کے لیے میں ان پر تھیلیاں چڑھا دیں۔ یہ جگہ مجھے اتنی اچھی لگی کہ میں نے ایک بار تو یہ فیصلہ کیا کہ میں یہیں پر گھر بنا کر رہوں اور سارا سامان اٹھا لاؤں۔ لیکن جب غور کیا تو میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ میرا پہلے والا مکان سب سے مناسب جگہ پر ہے۔ اگر قسمت نے میرا ساتھ دیا تو میری رہائی کا دارومدار سمندر سے ہی وابستہ ہے اور سمندر کے قریب رہنے ہی سے مجھے یہ موقع مل سکتا ہے۔ یہ سوچ کر میں نے نئی جگہ مکان بنانے کا ارادہ چھوڑ دیا۔ **جاری**

ادارہ

یہ مزے مزے کی حکائتیں...

• ایک شخص ڈاکٹر کے پاس گیا اور پوچھا کہ گھر پر مریض دیکھنے کا آپ کیا لیتے ہیں۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ اس کی فیس ڈھائی سو روپے ہے۔ اس شخص نے کہا تو پھر میرے ساتھ چلیے۔ ڈاکٹر اسے اپنی موٹر سائیکل پر بٹھا کر مریض دیکھنے چل دیا۔ گھر پہنچنے پر اس شخص نے ڈاکٹر کو ڈھائی سو روپے دیے اور جانے لگا۔ ڈاکٹر نے پوچھا مریض کہاں ہے؟ اس شخص نے جواب دیا: ''مریض کوئی نہیں ہے ڈاکٹر صاحب۔ دراصل آج ہڑتال کی وجہ ٹیکسی والے گھر پہنچانے کے چار سو روپے مانگ رہے تھے۔ آپ مل گئے تو ڈیڑھ سو کی بچت ہوگئی۔''

اعجاز خاں سروش، اردو ہائی اسکول اورنگ آباد

• بندر کیلے کیوں کھاتا ہے؟

...

...

چلو چھوڑو، یہ تمھارا ذاتی معاملہ ہے۔ جو چاہے کھاؤ پیو!

محمد ارشاد، مالیگاؤں، مہاراشٹر

• بیوی کے روز کے جھگڑوں سے تنگ آکر سنتا نے گھر چھوڑ دینے کی ٹھان لی اور اپنا سامان باندھنے کے بعد بیوی سے یہ کہہ کر چل دیا کہ اب میں تیرے ساتھ ایک پل بھی نہیں رہ سکتا۔ اسٹیشن پہنچ کر جیسے ہی اس نے ٹرین پر چڑھنے کی کوشش کی، تبھی آواز آئی: ''مت چڑھ۔ یہ پٹری سے اتر جائے گی۔''

سنتا ائر پورٹ چلا گیا۔ مگر جیسے ہی جہاز کی سیڑھیوں پر قدم رکھا آواز آئی، ''مت چڑھ۔ یہ کریش crash ہوجائے گا۔''

سنتا ہوائی جہاز چھوڑ کر بس اڈے چلا گیا۔ لیکن بس پر چڑھتے ہی آواز آئی، ''مت چڑھ۔ یہ کھائی میں جا گرے گی۔''

سنتا غصے سے بولا، ''کون ہے یار!''

آواز آئی، ''میں ہوں اوپر والا تیرا بھگوان''

سنتا نے کہا، ''جب میں شادی کے لیے گھوڑی پر چڑھا تھا تب آپ کہاں تھے جناب؟''

معاویہ عفت، اکولا

• ایک دوست دوسرے سے: ہمارے یہاں کسی نے نوکری نہیں کی۔

دوسرا دوست: کیوں بھلا؟

پہلا دوست: سب بھیک مانگتے تھے۔

مومن معز محمد عمر

• استاد شاگرد سے: اگر تم مغرب کی طرف چلو گے تو کیا ہوگا؟

شاگرد: میں غروب ہوجاؤں گا!

اریب ملک، مالیگاؤں

• ایک دوست دوسرے سے: ہم کہاں جارہے ہیں یار؟

دوسرا دوست: لانگ ڈرائیو پر

پہلا دوست: پہلے کیوں نہیں بتایا

دوسرا دوست: مجھے بھی کہاں پتہ تھا۔ اب پتہ چلا ہے۔

پہلا دوست: کیا مطلب؟ یہ کیا بکواس کر رہے ہو؟

دوسرا دوست: ابھی ابھی پتہ چلا ہے کہ کار کے بریک نہیں لگ رہے ہیں۔

سید عرفان، اردھاپور، ضلع ناندیڑ

• ایک پروفیسر صاحب اپنا خواب سنا رہے تھے۔

''میں نے خواب میں دیکھا کہ میں کلاس میں لیکچر دے رہا ہوں۔ جب آنکھ کھلی تو دیکھا میں واقعی کلاس میں لیکچر دے رہا تھا اور اسٹوڈنٹ سو رہے تھے۔''

ایم ایمن، اورنگ آباد

• پندرہ سال پہلے سموسہ پچاس پیسے کا تھا اور موبائل فون کال سات روپے کی۔ آج

سموسہ سات روپے کا ہے فون کال پچاس پیسے کی۔ لہٰذا مہنگائی بالکل نہیں بڑھی، بس قیمتیں ذرا اِدھر اُدھر ہوگئی ہیں۔

• ایک سائنس داں نے چور پکڑنے والی مشین ایجاد کی جسے کئی ملکوں نے خرید لیا۔

امریکہ میں مشین کی مدد سے ایک دن میں دس چور پکڑے گئے۔

چین میں تیس۔

انگلینڈ میں پچاس۔

اور ہمارے یہاں جانتے ہیں کیا ہوا؟

ایک گھنٹے میں مشین چوری ہوگئی۔

ماریہ تسنیم، مئوناتھ بھنجن، مئو، اتر پردیش

• ایک بار پیٹر پہاڑوں کی سیر پر گیا۔ راستے میں اسے ایک بڑا سا پتھر ملا جس پر لکھا تھا، ''اسے پلٹو گے تو کچھ بن جاؤ گے۔'' پیٹر نے خوب زور لگا کر پتھر کو پلٹا تو پیچھے لکھا ہوا تھا، ''دیکھا، بن گئے نا بے وقوف!''

ایم کامران، دسویں جماعت، اینگلو عربک سینئر سیکنڈری اسکول، اجمیری گیٹ، دہلی

• ایک بہرا آدمی اسکوٹر کھینچ کر لے جا رہا تھا۔ دوسرے بہرے نے اس سے پوچھا، ''کیا بات ہے؟ پیٹرول ختم ہوگیا کیا؟''

پہلے آدمی نے کہا، ''نہیں یار، پیٹرول ختم ہوگیا ہے۔''

دوسرا بولا، ''ٹھیک ہے۔ میں سمجھا تھا پیٹرول ختم ہوگیا ہے۔''

حارث خان سعادت خان، واشم، مہاراشٹر

• ایک شخص نوکری کے لیے دوسرے شہر گیا اور وہاں سے کچھ دن بعد اس نے اپنی بیوی کو ای میل سے میسیج بھیجا۔ غلطی سے وہ ای میل ایک

اور خاتون کے کمپیوٹر پر آ گیا جس کے شوہر کو ایک گھنٹہ پہلے ہی دفنایا گیا تھا۔ غم زدہ خاتون کو یوں لگا کہ ای میل اسی کے لیے ہے۔ لیکن میسیج پڑھتے ہی وہ بے ہوش ہوگئی۔ اس میں لکھا تھا:

''بیگم میں یہاں خیریت سے ہوں۔ یہاں انٹرنیٹ کی سہولت بھی ہے۔ کچھ دنوں بعد تمھیں بھی یہیں بلا لوں گا۔''

• حامد: کیا بات ہے تمھارا بھائی تاریخ History کے پیپر میں کیسے فیل ہوگیا۔

احمد: اس میں میرے بھائی کا کوئی قصور نہیں۔ دراصل پیپر میں اس سے ایسی باتیں پوچھی گئی تھیں جو اس کی پیدائش سے بھی بہت پہلے کی ہیں۔

شیخ شفا صدیقہ محمد اظہر، مالیگاؤں

• جج ملزم سے: تم نے اپنی بیوی کے سر پر کرسی کیوں دے ماری؟

ملزم: صوفہ بہت بھاری تھا جج صاحب!

یوسف رضا، کلاس xi سائنس، رمضان پورہ، مالیگاؤں

• ہاتھوں کی لکیروں پر کبھی بھروسہ نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ تقدیر ان کی بھی ہوتی جن کے ہاتھ نہیں ہوتے۔

ابوہنزالہ

• دہلی کے چڑیا گھر میں پچھلے دنوں سفید شیر نے ایک نوجوان کو جس طرح کھا لیا اس کی ویڈیو دیکھ کر دل دہل گیا۔ اگر وہاں امداد کرنے

والے عملے کے فون نمبر جگہ جگہ موٹے حروف میں لکھے ہوتے تو انھیں دیکھ کر کوئی نہ کوئی فون پر کال کر دیتا، اور شائد اس بے چارے نوجوان کی جان نہ جاتی!

ایم کے خلیل بنات، آسنسول، مغربی بنگال

• السلام علیکم! میں آپ سے ناراض ہوں کیونکہ میں نے دس ایس ایم ایس بھیجے آپ کے نمبر پر مگر ایک بھی شائع نہیں ہوا۔ Its not fare ہمارے پیسے لگتے ہیں ایس ایم ایس بھیجنے میں۔ مگر آپ انھیں نظر انداز کر دیتے ہیں۔

عارش ملک، پٹنہ، بہار

اوفوہ! مگر ہمیں تو ایک بھی نہیں ملا۔ اعزازی مدیر

• کہتے ہیں ایک منٹ میں زندگی نہیں بدلتی
لیکن ایک منٹ میں کیے گئے فیصلے زندگی بدل دیتے ہیں!

مرجینا خان، بھیونڈی، مہاراشٹر

• شہر میں چوہے یہاں وہاں دوڑتے پھر رہے تھے۔ اخباری نمائندے نے ایک بزرگ چوہے سے پوچھا، ”کیوں جناب، یہ آپ لوگ بھاگتے کیوں پھر رہے ہیں۔“

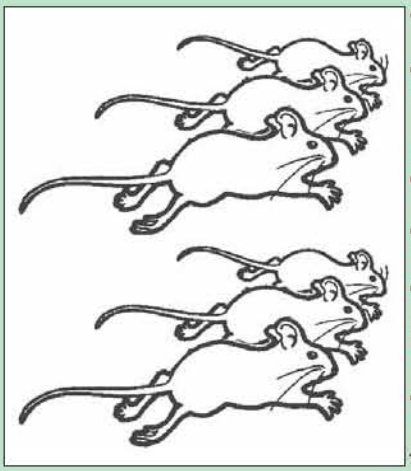

چوہے نے جواب دیا، ”بات یہ ہے بھائی کہ بلی کا قتل ہو گیا ہے اور پولیس ہم پر شک کر رہی ہے۔“

• ٹیچر: وہاٹ از یور نیم؟
اسٹوڈنٹ: میرا نام سورج پرکاش ہے۔
ٹیچر: جس زبان میں سوال کیا گیا ہے اسی میں جواب دینا چاہیے۔
اسٹوڈنٹ: او کے سر! مائی نیم از سن لائٹ!

نام نہیں دیا

• دوست روٹھے تو رب بھی روٹھے۔
پھر روٹھے تو دل ٹوٹے۔
پھر بھی روٹھے تو جگ روٹھے۔
اور اگر اس کے بعد بھی روٹھے تو، نکالو ڈنڈا، مارو سر پر،
جب تک ڈنڈا نہ ٹوٹے!

تبسم کوثر ایم حامد، ناندیڑ

• ڈاکٹر: اب طبیعت کیسی ہے؟
مریض: پہلے سے خراب ہے
ڈاکٹر: دوا پی لی تھی؟
مریض: نہیں، لال تھی
ڈاکٹر: میرا مطلب ہے دوا کھالی تھی؟
مریض: جی نہیں، دوا کی شیشی پوری بھری ہوئی تھی ڈاکٹر صاحب۔ ذرا سی بھی تو خالی نہیں تھی۔

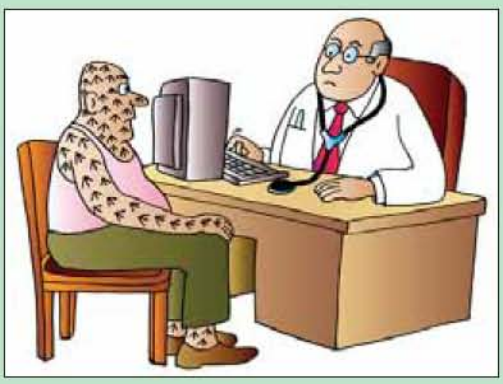

ڈاکٹر جھنجھلا کر: اف، میرا مطلب ہے دوا کو پی لیا تھا؟
مریض: مگر ڈاکٹر صاحب پیلیا تو مجھے ہوا تھا!

نام نہیں دیا

• بیوی: اگر میں مرگئی تو تم کتنے عرصے بعد دوسری شادی کرو گے؟
شوہر: تم تو جانتی ہی ہو آج کل مہنگائی کتنی ہے۔ اس لیے میری کوشش رہے گی کہ چہلم کی بریانی میں ہی ولیمہ ایڈجسٹ ہو جائے!

انھوں نے بھی نام نہیں دیا

• تعلیم سے متعلق گانے:
اسکول: اپنی تو پاٹھ شالا مستی کی پاٹھ شالا۔
ٹیوشن: اِدھر چلا میں اُدھر چلا وہ
میتھس: عجیب داستاں ہے یہ... کہاں شروع کہاں ختم...
سائنس: آخوشی سے خودکشی کر لیں.../ یہ کیا ہوا، کیسے ہوا، کیوں ہوا... چھوڑو یہ نہ سوچو...
جغرافیہ: مسافر ہوں یارو... نہ گھر ہے نہ ٹھکانا... مجھے چلتے جانا ہے
اکونومکس: کیوں پیسہ پیسہ کرتی ہے کیوں پیسے پے تو مرتی ہے...
ایگزام: زہریلی راتیں... نیند اڑ جاتی ہے...
رزلٹ: جیا دھڑک دھڑک جائے...
پاس: آج میں اوپر، آسماں نیچے...
فیل: جگ سونا سونا لاگے.../ اس بھری دنیا میں کوئی بھی ہمارا نہ ہوا

عائشہ عشرت، ناندیڑ

اس مہینے کا ایس ایم ایس

• لڑکا: روتی کیوں ہو؟
لڑکی: میرے مارکس بہت کم آئے ہیں
لڑکا: کتنے؟
لڑکی: صرف 88 پرسینٹ
لڑکا: خدا کو خوف کر ظالم، اتنے میں تو دو لڑکے پاس ہو جائیں!

عائشہ عشرت، ناندیڑ

• لڑکا: کہاں جا رہی ہو؟
لڑکی: خودکشی کرنے
لڑکا: اتنا میک اپ کر کے...؟
لڑکی: کل اخباروں میں تصویر بھی آئے گی نا بے وقوف!

نوشین بیگم، ناندیڑ

• ایک پاگل، بکرے پر بیٹھ کر گھوم رہا تھا۔
دوسرے پاگل نے یہ دیکھ کر کہا: ”تجھے پولیس پکڑ لے گی۔“
پہلے پاگل نے پوچھا: ”کیوں؟“ دوسرے پاگل نے کہا: ”تو نے ہیلمٹ نہیں پہنی ہے، اس لیے!“
تیسرا پاگل یہ سب دیکھ کر بولا: ”پاگلو یہ سواری ٹو وہیلر نہیں، فور وہیلر ہے! اس لیے ہیلمٹ لگانا ضروری نہیں۔“

سونو، ناندیڑ

دسویں جماعت کے، مالیگاؤں والے خالد پرویز کو معلوم ہو کہ ہوائی جہاز اتنا وزنی ہو کر بھی کیسے اڑتا اور دور تک چلا جاتا ہے اس پر ایک مضمون چھاپنے کی ان کی فرمائش نوٹ کر لی گئی ہے۔ ’بچوں کی دنیا‘ کو اتنا پسند کرنے کا شکریہ

■

اپنے اردو ایس ایم ایس صرف اس نمبر بھیجیں
9540165653
اور ہاں صرف ایس ایم ایس بھیجیں۔ کال کا جواب نہیں ملے گا۔ کال کے لیے دفتری ٹیلی فون نمبر استعمال کریں

ادارہ

بچّوں کا اخبار

میرٹھ میں پانچ فٹ 7انچ کا بچّہ

یقین کیجیے۔ میرٹھ، اتر پردیش، کے کرن سنگھ کا قد 5فٹ 7انچ ہے جب کہ اس کی عمر صرف ساڑھے پانچ سال ہے۔اس عمر میں اتنے قد کے لیے اس کا نام گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈز میں پہلے ہی آ چکا ہے۔اس کی 25سال کی والدہ کا قد 7فٹ 2انچ ہے اور ابھی بڑھ ہی رہا ہے۔ان کا بھی گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں نام آیا تھا جسے مغربی بنگال کی صدیقہ پروین نے توڑ دیا۔ اوسط سے بہت زیادہ لمبا ہونا انسانوں کے لیے اچھا نہیں پایا گیا ہے۔ایک تو وہ عام زندگی نہیں گزار پاتے دوسرے ان کی عمر عام طور پر کم ہوتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ کرن سنگھ کے والد اس کے لیے بہت فکر مند بھی رہتے ہیں۔

اے ٹی ایم پر دواؤں کی سہولت

ہندوستان میں نیا تجربہ

اب آپ اے ٹی ایم سے دوائیں بھی نکال سکتے ہیں۔ہندوستان کے دیہات میں جلد ہی ایسی مشینیں لگائی جائیں گی جن سے اپنی ضرورت کی کئی دوائیں خریدی جا سکیں گی۔ صحت کے لیے کام کرنے والی ایک تنظیم یہ کام کر رہی ہے۔اس کا کہنا ہے کہ سب سے پہلے دواؤں کی اے ٹی ایم راجستھان میں لگائی جائیں گی جہاں لوگوں کو دوائیں لینے کے لیے بہت دور تک جانا پڑتا ہے۔

ای پیپر گھڑی جلد ہی بازار میں

ایک مشہور الیکٹرانک کمپنی نے ای پیپر سے بنی ایک گھڑی تیار کی ہے اس گھڑی کو فیس Fes واچ کا نام دیا گیا ہے۔ کمپنی کے مطابق اس گھڑی کی بیٹری کم از کم 60 دن تک چلے گی۔گھڑیوں اور اس قسم کی مصنوعات کے ماہر اسٹیورٹ مائلز نے پیشین گوئی کی ہے کہ اگلے سال سے فیشن ٹیکنالوجی میں یہ گھڑی بہت کچھ بدل دے گی۔اس گھڑی کا ڈائل اور اسٹریپ ای پیپر سے بنا ہوا ہے۔اس ٹیکنالوجی کا مقابلہ اس ٹیکنالوجی سے کیا جا سکتا ہے جو ای کتابیں پڑھنے کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ جیسے ایمازون Amazon کی کنڈل Kindle۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ گھڑی کا ڈائل اور اسٹریپ دونوں مختلف سٹائلز میں لیے جا سکتے ہیں۔امریکی اخبار وال سٹریٹ جرنل کا کہنا ہے کہ کمپنی نے اس گھڑی کی تیاری کو دانستہ طور پر چھپا کر رکھا اور ایک کمپنی فیشن انٹرٹینمنٹ کو اس پر کام کرنے دیا۔فیشن انٹرٹینمنٹ نے گھڑی کی تیاری کے لیے فنڈز اکٹھا کرنے کے کئی پروگرام کیے جن کا اصل مقصد گھڑی میں لوگوں کی دلچسپی کو جانچنا تھا۔اس کام میں شریک ایک شخص نے وال اسٹریٹ جرنل کو بتایا کہ ”ہم نے جان بوجھ کر ان پروگراموں میں اصل کمپنی کا نام ظاہر نہیں کیا“ آگے چل کر ای پیپر سے جوتے، ٹائی اور عینکیں بنانے کی بات بھی چل رہی ہے۔ کمپنی نے اس گھڑی کو لانچ کرنے کی تاریخ کا ابھی اعلان نہیں کیا ہے۔

خبریں: بشکریہ: بی بی سی اردو، نو بھارت ٹائمز

بچوں کی تخلیقات

ادارہ

کارٹونسٹ: اسما نشاط درجہ نہم ہارسی ٹاکلی ضلع اکولا مہاراشٹر

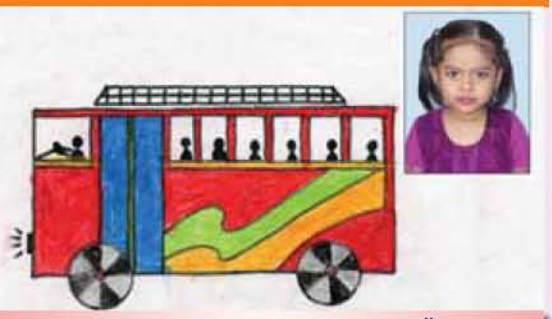

کارٹونسٹ: تسنیم عفت جنید احمد کے جی پرائمری اسکول مالیگاؤں

کارٹونسٹ: ثنا پروین بیگ درجہ ہفتم بی، جلگاؤں ضلع بلڈانہ مہاراشٹر

کارٹونسٹ: التمش صغیر درجہ سوم ڈی اے وی کالج گیا بہار

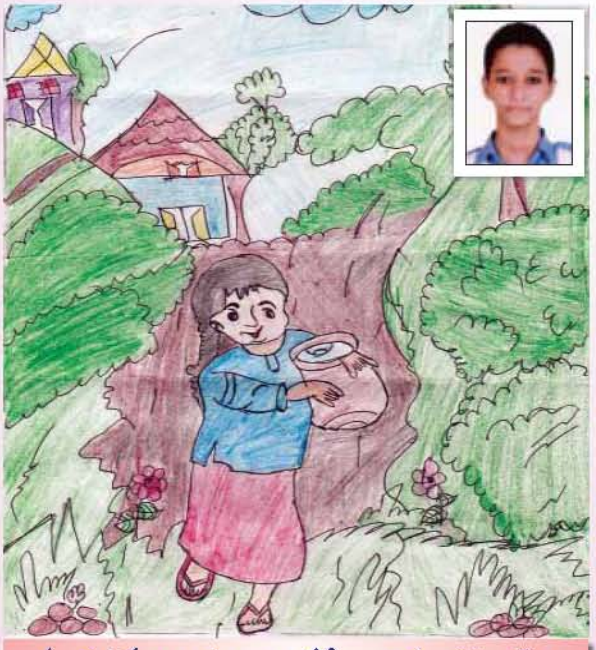

ڈرائنگ: آفرین فرزانہ درجہ ششم جسولہ ہائر سیکنڈری اسکول نئی دہلی

آپ کی باتیں

اردو Facebook

انکل آداب! میرا نام مریم جمیلہ ہے، عمر سات سال اور میں دوسری جماعت میں پڑھتی ہوں۔ سب سے پہلے اردو کونسل کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں کہ ہم بچوں کے لیے اس نے ایک اچھی ، دل چسپ اور خوب صورت میگزین شروع کی۔ میری امّی اور میرے ابّو اردو زبان سے بہت اچھی طرح واقف ہیں۔ وہ مجھے پابندی سے اردو زبان سکھاتے اور پڑھاتے ہیں۔ اسکول میں بھی میں اردو زبان پڑھتی ہوں۔ اردو ہم بچّوں سے بھی بڑھ کر خوب صورت ہے، میری شاذیہ میڈم بھی کہتی ہیں کہ ہم سبھی کو اردو پڑھنی چاہیے۔ 'بچوں کی دنیا' میں کارٹون اور ان پر لکھی کہانیاں پڑھنا مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ نظمیں بھی بہت اچھی اور دل چسپ ہوتی ہیں۔ مجھے کئی نظمیں یاد بھی ہیں۔ بس آپ اسی طرح یہ پیاری سی میگزین چھاپتے رہیں۔ مجھے ڈرائینگ بنانے کا بہت شوق ہے۔ کیا آپ میری ڈرائینگ چھاپیں گے؟

مریم جمیلہ، اسکالر پبلک اسکول، ابوالفضل اینکلیو پارٹ 1، نئی دہلی

انکل آداب! کیا رونق جمال انکل کے شہر میں کوئی جھگی جھونپڑی، غریبوں کی بستی نہیں ہے؟ اگلی عید پر وہ ایسی ہی کسی جھگی بستی یا غریبوں کی کالونی میں چلے جائیں۔ وہاں بچّوں کو عیدی تقسیم کرنے سے ان کے جذبات کی بھی تسکین ہوجائے گی اور بچّوں کے چہرے بھی کھل جائیں گے۔

مدیحہ گوہر خان، معرفت ارشاداللہ خاں ریتھ پور ضلع امراوتی، مہاراشٹر

رونق جمال صاحب کا مضمون 'عیدی' اکتوبر کے شمارے میں چھپا تھا

انکل! میرا نام محمد کاشف رضا ہے۔ میں مدرسہ حنفیہ ضیاالقرآن میں تعلیم حاصل کرتا ہوں۔ 'بچّوں کی دنیا' پڑھ کر بڑی خوشی میسر ہوئی۔ یہ

ماہنامہ ترقی کی منزلیں بہت تیزی سے طے کررہا ہے۔ یہ آپ کی بے لوث خدمت اور محبت کا نتیجہ ہے اس کے لیے میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔ دعا ہے کہ خدا آپ کو اردو کی خوب خدمت کرنے کی توفیق بخشے۔

محمد کاشف رضا، بدھولیہ سی بی گنج بریلی شریف، اتر پردیش

انکل سلام علیکم! میں شیخ رخسار سلطان 'بچوں کی دنیا' بہت شوق سے پڑھتی ہوں پہلے ہمارے اسکول میں یہ رنگین رسالہ

اگست میں آیا تھا۔ صرف ایک۔ ہر بچہ چاہتا تھا کہ یہ مجھے پڑھنے کو ملے۔ ہمارے استاد محترم نے اس کا انتظام کرایا۔ ہر طرف اس کا چرچا رہتا ہے۔ گھر میں بڑوں کو بھی یہ رسالہ بے حد پسند آیا ہے۔ اور ہاں اس رسالے کو پڑھنے والے سبھی بچّوں سے میری درخواست ہے کہ رسالے کو صرف پڑھنا ہی نہیں ہے بلکہ اس میں کہانیوں وغیرہ سے جو سبق حاصل ہوتا ہے اس پر عمل کرنا بھی ضروری ہے۔ دوستو آپ نے وہ قول ضرور سنا ہوگا کہ 'بغیر عمل کے علم فضول ہے' میں نے بہت رسالے دیکھے مگر ایسا نہیں۔ خدا سے دعا ہے کہ اس رسالہ کو اور بلند مرتبہ عطا فرمائے۔ انشااللہ یہ یوں ہی قائم رہے گا۔

شیخ رخسار سلطان، ریحان پبلیس، ستارا اورنگ آباد مہاراشٹر

انکل سلام علیکم! میں تیسری جماعت میں پڑھتی ہوں۔ 'بچّوں کی دنیا' بہت خوب صورت ہے۔ یہ ہر مہینہ بلا ناغہ سٹی بک ڈپو سے ہمارے ہاں آتا ہے۔ آپس کی باتیں نظمیں کہانیاں کامکس اردو ایس ایم ایس فیس بک مجھے بہت پسند ہیں اور چھوٹی بہن مزمّل تسنیم کو بھی سناتی ہوں۔

مصفا میمونہ، نیا اسلام پورہ، مالیگاؤں، ضلع ناسک

مگر یہ بتایئے مصفا، آپ نے اپنی تصویر کیوں نہیں بھیجی؟